Regd. L. No. 7243

Phone.

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مئی 1970

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی!

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کیلئے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اسکے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے نہ کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور نہ کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج رہی۔ انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظم کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر　　بحق دل بند و راہِ مصطفےٰ رو

(معراجِ انسانیت - پرویز)

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور ۱۱

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدلِ اشتراک

پاکستان
سالانہ ——— دس روپے

ہندوستان
سالانہ ——— پندرہ روپے

غیر ممالک
سالانہ ——— ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ

پاکستان ——— ایک روپیہ

ہندوستان

ڈیڑھ روپیہ

ٹیلیفون

۸۰۸۰۰

خط و کتابت

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵۔ بی گلبرگ۔ لاہور

جلد ۲۳ | مئی ۱۹۷۰ء | نمبر ۵

فہرست

۱۔ لمعات ——— ۲

۲۔ اس دور میں دیانتدار بننا حماقت ہے۔ ——— (محترم پرویز صاحب) ——— ۹

۳۔ پاکستان کا مطلب کیا؟ ——— (محترم پرویز صاحب) ——— ۲۵

۴۔ مفہوم القرآن کا نیا ایڈیشن ——— ۴۸

۵۔ ہمارا پریس ——— ۴۹

۶۔ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں ——— ۵۵

۷۔ طلوعِ اسلام کالج ——— ۵۷

۸۔ عورتوں کے اسلامی حقوق ——— (شاہد عادل) ——— ۵۹

۹۔ ختمِ نبوت ——— (محترم پرویز صاحب) ——— ۶۵

۱۰۔ حقائق و عبر ——— ۷۳

۱۱ نقد و نظر ——— ۷۷

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقام اشاعت ۲۵/بی گلبرگ۔ لاہور۔ پرنٹر شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

مطالبۂ پاکستان کی بنیاد یہ تھی کہ

(۱) اسلام کی رُو سے قومیت کا معیار، وطن کا اشتراک نہیں بلکہ ایمان کا اشتراک ہے۔ اس لئے ہندو اور مسلمان ایک ملک کے باشندے ہونے کے اعتبار سے ایک قوم کے افراد نہیں۔ ہندو ایک الگ قوم ہیں اور مسلمان الگ قوم۔

(۲) اسلام ایک زندہ حقیقت اسی صورت میں بن سکتا ہے جب مسلمانوں کی اپنی الگ آزاد مملکت ہو جس میں یہ قرآنی اصول و احکام کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

قومیت کا یہ معیار ہمارے سیاسی تقاضوں کا وضع کردہ نہیں تھا۔ یہ قرآن کی پیش کردہ ازلی حقیقت تھی جسے علامہ اقبالؒ نے مطالبۂ پاکستان سے بہت پہلے، ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ

بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے!

پھر انہوں نے، وطنیت کے بت کو "غارت گرِ کاشانۂ نبویؐ" کہہ کر مسلمان سے پوری قوت اور شدت کے ساتھ کہا تھا کہ ؎

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفویؐ خاک میں اس بت کو ملا دے

مثبت طور پر مسلمانوں کو سمجھایا تھا کہ

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی!

یہی وہ حقیقت تھی جسے قائداعظمؒ تحریکِ پاکستان کے دوران بار بار دہراتے رہے۔ انہوں نے ۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

> ہندو اور مسلمان خواہ ایک ہی قصبہ یا گاؤں میں کیوں نہ رہتے ہوں کبھی ایک قوم کے افراد نہیں بن سکتے۔ وہ ہمیشہ الگ الگ عناصر کی حیثیت سے رہے ہیں..... پاکستان تو اسی دن وجود میں آگیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔ یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔

اسی حقیقت کو انہوں نے ۱۴ نومبر ۱۹۴۵ء کو ایڈورڈز کالج پشاور کے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے ان الفاظ میں دہرایا تھا کہ

> ہم دو قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں۔ ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین ہمیں ایک ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے ہم اسی ضابطے کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

یہی وہ دعوے تھا جس کی مخالفت اس شد و مد سے ہندوؤں (اور ان کے ہمنوا کانگریسی مسلمانوں) کی طرف سے ہوئی تھی۔ لیکن ان کی مخالفت کے علی الرغم قائداعظمؒ اپنے اس دعوے کو برابر دہراتے چلے جاتے تھے کیونکہ یہ دعوے کسی سیاسی مصلحت کا ترا شیدہ نہیں تھا، خود اسلام کا بنیادی تقاضا تھا۔ یہی وہ حقیقت تھی جسے انہوں نے (مہاتما) گاندھی کے نام اپنے خط میں ان الفاظ میں بیان کیا تھا۔

> اس باب میں مجھے نہ کسی قسم کا دھوکا ہے نہ شک و شبہ کہ نہ ہندوستان میں ایک قوم بستی ہے اور نہ ہی یہ ایک ملک ہے۔ یہ برصغیر مختلف اقوام کا مجموعہ ہے جن میں ہندو اور مسلمان دو بڑی بڑی قومیں ہیں۔ آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے۔ لیکن آپ سے جب یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے اور وہ کون سی قوت محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ کیا وہ مذہب ہے، سیاست ہے یا عمرانی اصلاح ہے، تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے..... (لہٰذا مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے نہیں ہیں) آج انسانی سعی و عمل کا دائرہ ایک ناقابلِ تقسیم وحدت بن چکا ہے۔ آپ تمدنی، معاشی، سیاسی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے۔ جس مذہب کو نوعِ انسانی کے معاملات سے واسطہ نہیں ہے اس کو مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر عمل کے لئے اخلاقی بنیاد

> مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ انسانی زندگی نہیں محض غوغا آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے جس میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے لیکن مقصد کچھ نہیں۔
>
> (جناح کا خط بنام گاندھی - جنوری ۱۹۴۴ء)

اور اسی دعویٰ کی بنیاد پر ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا! لیکن آسمان کی آنکھ نے اس سے بڑا طرفہ تماشہ شاید ہی کہیں دیکھا ہو کہ وہ دعویٰ جسے ہم اپنے ایمان کی بنیادوں پر مسلسل دس سال تک دہراتے رہے، یہاں آتے ہی ہم نے اسے یوں تہ کر کے رکھ دیا کانہٗ لم یکن شیئاً مذکورا۔ گویا یہ کبھی قابلِ ذکر شے تھا ہی نہیں۔ ہم نے یہاں آنے کے بعد، پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک قوم تصور کر لیا۔ یعنی ہم نے اس اصول کو بالائے طاق رکھ دیا کہ اسلام کی رو سے قومیت کا معیار، ایمان کا اشتراک ہوتا ہے، وطن کا اشتراک نہیں۔ اور اس کے بجائے ہم نے اس اصول کو تسلیم کر لیا کہ جس کے خلاف ہم مسلسل جنگ کرتے چلے آ رہے تھے۔ اگر ہم نے ہندوستان میں اس اصول کو محض ایک سیاسی مصلحت کے طور پر اختیار کیا ہوتا تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا کیونکہ سیکولر نظام میں کوئی اصول غیر متبدل نہیں ہوتا بلکہ مصلحت کے تابع ہر اصول ہر وقت بدلا جا سکتا ہے لیکن ہم نے اس اصول کو 'دین کے اصول' کے طور پر اختیار کیا تھا۔ اور دین کے اصول ہمیشہ غیر متبدل ہوتے ہیں۔ طلوعِ اسلام نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور قوم سے کہا کہ وہ دین کے ساتھ کیا مذاق کر رہی ہے۔ اس سے خدا کے ہاں ہمارا جو مؤاخذہ ہو گا وہ تو ہو گا، سوچئے کہ اقوامِ عالم کی نظروں میں ہمارا کیا وقار رہ جائے گا اور وہ خود اسلام کے متعلق کیا رائے قائم کریں گی۔ لیکن اس سے کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ ہم برابر اپنی اس پکار کو دہراتے رہے (کہ ہم اتنا ہی کر سکتے تھے) اور قوم اسے برابر اَن سنی کر کے آگے بڑھتی چلی گئی۔ اور حیرت بالائے حیرت کہ وہ لوگ جنہیں 'انتہائی' اسلام پسند ہونے کا دعویٰ تھا، انہوں نے بھی اس کے متعلق ایک لفظ تک زبان پر لانا ضروری نہ سمجھا۔ اس کے بعد ۱۹۵۶ء میں پاکستان کا پہلا آئین مرتب اور منظور ہو کر قوم کے سامنے آ گیا اور ہم یہ دیکھ کر ورطۂ حیرت میں ڈوب کر رہ گئے کہ اس میں بھی پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک قوم تصور اور تسلیم کر لیا گیا۔ اس میں صرف صدرِ پاکستان کے مسلمان ہونے کی شرط رکھی گئی تھی۔ حتیٰ کہ اس میں یہ شق بھی نہیں تھی کہ انتخاب غیر مخلوط ہوں گے — یعنی مسلمان امیدوار صرف مسلمان رائے دہندگان کے ووٹ سے منتخب ہو سکیں گے اور غیر مسلم امیدوار غیر مسلم رائے دہندگان کے ووٹ سے۔ اس آئین کو اسلامی آئین قرار دے کر ملک میں چراغاں کیا گیا۔ طلوعِ اسلام نے اس کے خلاف احتجاج کیا اور اپنی بساط کے مطابق نہایت سختی اور شدت کے ساتھ احتجاج کیا — لیکن اس کی تائید میں کسی ایک گوشے سے بھی کوئی آواز نہ اٹھی — یعنی اس مسلک احتجاج کی تائید میں کہ اس آئین کی رو سے، پاکستان

میں بسنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک قوم کس طرح تسلیم کر لیا گیا ہے، کیونکہ قومیت کی یہ بنیاد یکسر خلافِ اسلام ہے اور اس دعویٰ کی نقیض جو ہمارے مطالبہ وحصولِ پاکستان کی بنیاد تھا۔ دو سال کے بعد (۱۹۵۸ء کے عسکری انقلاب کے نتیجہ میں) یہ آئین کالعدم ہو گیا۔ ازاں بعد ۱۹۶۲ء کا آئین وجود میں آیا تو اس میں بھی تمام باشندگانِ پاکستان کو مخلوط طور پر ایک قوم تسلیم کر لیا گیا تھا۔

اب ایک جدید آئین کی تدوین کا مسئلہ درپیش ہے۔ ملک میں کوئی پارٹی ایسی نہیں جس کا دعویٰ یہ نہ ہو کہ وہ اسلامی نظام کا نفاذ چاہتی ہے اور اس دعویٰ کے باوجود کسی پارٹی نے یہ نہیں کہا کہ آئینِ پاکستان، دو قومی نظریہ کی بنیاد پر مرتب ہونا چاہیئے۔ حتیٰ کہ جماعتِ اسلامی کی طرف سے بھی ایسا نہیں کہا گیا۔

ہم نے اس ضمن میں جماعتِ اسلامی کا نام جو خصوصیت سے لیا ہے تو اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ یہ حضرات اس دعویٰ کو بڑی شد ومد سے پیش کرتے ہیں کہ مودودی صاحب نے دو قومی نظریہ کی نشر واشاعت سے تحریکِ پاکستان کے لئے زمین ہموار کر دی تھی، اور ان کی یہ خدمت اتنی گراں بہا ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مودودی صاحب نے دو قومی نظریہ کی تائید میں کچھ مضامین شائع کئے تھے۔ اس کے بعد جب جماعتِ اسلامی کا قیام عمل میں آیا ہے تو ان کے مکتبہ (واقع دارالاسلام۔ پٹھان کوٹ) کی طرف سے، ان مضامین کا مجموعہ "مسئلہ قومیت" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس میں مودودی صاحب نے کہا تھا کہ یہ اسلام کا بنیادی اور غیر متبدل اصول ہے کہ قومیت کا معیار صرف ایمان کا اشتراک ہے۔ وطن کے اشتراک سے مسلمان اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد قرار نہیں پا سکتے۔ یہ نظریہ جاہلیت کا فلسفہ کا ترانہ ہے۔ انہوں نے لکھا تھا کہ

> اللہ اور اس کے رسولؐ نے جاہلیت کی ان تمام محدود مادی حسی اور وہمی بنیادوں کو، جن پر دنیا کی مختلف قومیتوں کی عمارتیں تعمیر کی گئی تھیں، ڈھا دیا۔ رنگ، نسل، وطن، زبان، معیشت اور سیاست کی غیر عقلی تفریقوں کو، جن کی بنا پر انسان نے اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے انسانیت کو تقسیم کر رکھا تھا، مٹا دیا۔ اور انسانیت کے مادے میں تمام انسانوں کو برابر ایک دوسرے کا ہم مرتبہ قرار دے دیا۔
>
> اس تخریب کے ساتھ اس نے خالص عقلی بنیادوں پر ایک نئی قومیت کی تعمیر کی۔ اس قومیت کی بنا بھی امتیاز پر تھی، مگر مادی اور وطنی امتیاز پر نہیں بلکہ روحانی اور جوہری امتیاز پر۔ اس نے انسان کے سامنے ایک فطری صداقت پیش کی جس کا نام "اسلام" ہے۔ اس نے خدا کی بندگی واطاعت، نفس کی پاکیزگی وطہارت، عمل کی نیکی اور پرہیزگاری کی طرف ساری نوعِ بشری کو دعوت دی پھر کہہ دیا کہ جو اس دعوت کو قبول کرے وہ

ایک قوم ہے اور جو اس کو رد کرے وہ دوسری قوم ہے۔ ایک قوم ایمان اور اسلام کی ہے اور اس کے سب افراد ایک امت ہیں۔ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا۔ اور ایک قوم کفر اور گمراہی کی ہے اور اس کے متبعین اپنے اختلافات کے باوجود ایک گروہ ہیں۔ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ۔

(مسئلہ قومیت ۱۹۴۷ء ایڈیشن صفحہ ۲۰)

آگے چل کر اسی سلسلہ میں لکھا تھا۔

جس طرح ایک سلطنت میں کئی سلطنتیں نہیں بن سکتیں، اسی طرح ایک قومیت میں کئی قومیتیں بھی نہیں بن سکتیں۔ اسلامی قومیت کے اندر نسلی، وطنی، لسانی اور لونی قومیتوں کا جمع ہونا قطعاً محال ہے۔ ان دونوں قسم کی قومیتوں میں سے ایک ہی قائم رہ سکتی ہے، اسلئے

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے!

پس جو مسلمان ہے اور مسلمان رہنا چاہتا ہے اسے تمام قومیتوں کے احساس کو باطل اور سارے خاک اور خون کے رشتوں کو منقطع کرنا پڑے گا۔ اور جو ان رشتوں کو قائم رکھنا چاہتا ہے اس کے متعلق ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ اسلام اس کے قلب و روح میں نہیں اترا۔ جاہلیت اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے۔ آج نہیں تو کل وہ اسلام سے چھوٹیگا اور اسلام اس سے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۳۲)

ان کی یہ ساری تالیف (مسئلہ قومیت) اسی قسم کی تصریحات سے بھری پڑی ہے اور یہی ہے مودودی صاحب کی وہ عظیم خدمت جسے اس شد و مد سے آج بھی قوم کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ ہم جماعتِ اسلامی سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ

(۱) کیا وہ تشکیلِ قومیت کے اس اصول کو جسے وہ کفر اور اسلام میں مابہ الامتیاز قرار دیتے تھے، آج بھی اسی طرح صحیح سمجھتے ہیں یا اس سے منحرف ہو چکے ہیں۔

(۲) اگر وہ اسے دین کی ایک ابدی حقیقت سمجھتے ہیں، تو کیا انہوں نے اپنے کسی منشور میں کسی قرار داد میں، اس مطالبہ کو پیش کیا ہے کہ باشندگانِ پاکستان میں سے مسلمان 'بربنائے دین' ایک الگ قوم ہیں اور غیر مسلم ایک جداگانہ قوم کے افراد، اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک قوم تسلیم کرنا، باطل اور کفر ہے۔

(۳) جس جمہوریت کے احیاء کے لئے آپ اتنے عرصے سے کوشاں ہیں اور جسے آپ عین اسلامی قرار دیتے ہیں، کیا آپ نے اس کے لئے کبھی یہ شرط عاید کی ہے کہ اس جمہوریت سے مراد خالصتہً مسلمانوں کی جمہوریت ہے جس میں

غیر مسلم کسی صورت میں مشرک نہیں کہے جا سکتے کیونکہ وہ ایک الگ قوم کے افراد ہیں اور جب ہم اس جمہوریت کے مختلف عناصر و عوامل کی تشکیل آبادی کی بنیاد پر کرینگے تو وہ صرف مسلمانوں کی آبادی پر مشتمل ہوگی مسلمانوں اور غیر مسلموں کی مخلوط آبادی پر نہیں۔

(۴) اگر آپ نے اب تک ایسا نہیں کیا تو کیا آپ اس آئین کے لئے جس کی مدوین کا سوال اس وقت زیر غور ہے، اس اصول کو آئین کی بنیاد قرار دینے کا مطالبہ کرینگے؟

(۵) اگر آپ اس کے لئے تیار نہیں تو کیا آپ اس کا اعلان کرینگے کہ آپ اس ملک میں اسلامی نظام نہیں بلکہ کافرانہ نظام قائم کرنے کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔ اسلئے کہ مودودی صاحب نے لکھا تھا کہ

> وطنیت کے داعیوں کو اگر یہ کام کرنا ہی ہے (یعنی وطن کی بنیاد پر ایک قوم کی تشکیل کا کام) تو بہتر ہے کہ اپنے آپ کو اور دنیا کو دھوکا نہ دیں بلکہ جو کچھ کریں یہ جان کر کریں کہ وطنی قومیت کی دعوت محمد رسول اللہ کی دعوت کی عین ضد ہے۔ (ایضاً ص۳۵)

یہ تو ہم جماعت اسلامی سے پوچھنا چاہتے ہیں اور قوم سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ ہر اس پارٹی سے جس کا دعویٰ یہ ہو کہ وہ ملک میں اسلامی نظام قائم کرنا چاہتی ہے (اور آج کوئی پارٹی بھی ایسی نہیں جس کا یہ دعویٰ نہ ہو) یہ وضاحت کرے کہ کیا وہ —

(۱) اس کے قائل ہیں یا نہیں کہ اسلام کی رُو سے، مسلمان اور غیر مسلم (خواہ وہ ایک ہی ملک کے باشندے کیوں نہ ہوں) ایک قوم کے افراد نہیں قرار دیئے جا سکتے۔ اور

(۲) اگر وہ اس کے قائل ہیں تو کیا وہ مجوزہ آئین پاکستان کو انہی خطوط کے مطابق مرتب کرنے کا وعدہ اور اعلان کرنے کے لئے تیار ہیں یا نہیں۔

اور قوم کو چاہیئے کہ وہ صرف اس گروہ کا ساتھ دے جو اس اصول پر کاربند ہونے کا وعدہ کرے۔

(۰)

واضح رہے کہ ہم نے جو کچھ کہا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں۔ قرآن کریم نے اس اصول کو آج سے چودہ سو سال پہلے پیش کیا اور حضور نبی اکرمؐ نے اس اصول کے مطابق ایک ایسی امت کی تشکیل فرما دی جس میں کوئی غیر مسلم شامل نہیں تھا۔ اسی اصول پر ہم نے مطالبۂ پاکستان کی بنیاد رکھی اور مسلسل دس سال تک اسے دہراتے رہے۔ اگر ہم اس اصول سے انحراف کرینگے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ

(۱) ہم اُس اسلام کے بنیادی اصول سے انحراف کرینگے جس کی خاطر ہم نے پاکستان قائم کیا ہے۔

(۲) دنیا ایسا سمجھنے کے لئے حق بجانب ہوگی کہ ہمارا یہ دعوے ہمارے دین کا تقاضا نہیں تھا، ہم نے اسے

بعض ایک سیاسی حربہ کے طور پر استعمال کیا تھا۔ اور

(۳) اس کے بعد ہماری جداگانہ مملکت کی بنیاد ہی متزلزل ہو جائے گی۔

نہ ہی ہمارے اس اصول سے پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں کو کسی قسم کا خدشہ محسوس کرنا چاہیئے۔ وہ اسلامی قومیت کے اجزاء تو نہیں بن سکتے لیکن پاکستان کی اسلامی مملکت ۔۔۔ از روئے اسلام ۔۔۔ ان کے جملہ انسانی حقوق کی محافظ نہیں بلکہ ذمہ دار بھی ہوگی ۔۔۔ اسی جہت سے ہمارے ہاں اسلامی مملکت میں بسنے والے غیر مسلموں کے لئے ذمی کی اصطلاح وضع ہوئی تھی جس کے معنی ہیں وہ غیر مسلم جن کے حقوقِ انسانیت کی ذمہ داری اسلامی مملکت نے لے رکھی ہو۔ ان کے ان حقوق کا تعین آئینی طور پر کیا جائے گا اور ان کے تحفظ کی ضمانت کے لئے عدلیہ کا دروازہ کھلا ہوگا۔ وہ مملکت کے آئین و قوانین سازی کے امور میں شریک نہیں ہو سکیں گے۔ بات بالکل واضح اور حق بجانب ہے جس آئین اور ضابطہ قوانین کی شرط اولین یہ ہے کہ وہ اسلام کے خلاف نہیں ہوں گے' ان کی تدوین و ترتیب میں وہ لوگ کس طرح شریک ہو سکتے ہیں جو اسلام پر ایمان ہی نہ رکھتے ہوں۔ دنیا میں جس مملکت کی بنیاد بھی کسی غیر متبدل نظریہ حیات پر ہوگی' اس کے مہمات امور میں وہ لوگ شریک نہیں ہو سکیں گے جو اس نظریہ کی صداقت پر ایمان نہ رکھتے ہوں۔ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جس کے لئے کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں' پاکستان سیکولر اسٹیٹ نہیں آئیڈیالوجیکل اسٹیٹ ہے اور آئیڈیالوجیکل اسٹیٹ کی یہ بنیادی خصوصیت ہوتی ہے۔ اس کی آئیڈیالوجی خود اسلام ہے اور جو شخص اسلام کی حقانیت پر ایمان نہیں رکھتا وہ امور مملکت میں شریک نہیں ہو سکتا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی نظام کے قیام کے مدعیوں کا' اسلام کے اس بنیادی تقاضے کے متعلق ردِ عمل کیا ہوتا ہے۔ یہ کسوٹی کھرے اور کھوٹے کی فوراً پرکھ کر دے گی۔

(۔۔۔)

پرویز صاحب کا درس قرآن کریم

لاہور میں محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم ہر اتوار کی صبح ۸½ بجے ۲۵/بی ۔ گلبرگ میں ہوتا ہے۔

(خواتین کے لئے پردہ کا انتظام ہوتا ہے)　　(ناظم ادارہ طلوع اسلام)

اِس دور میں دیانتدار بننا حماقت ہے

(سلیم کے نام خط)

جب معاشرہ میں بد دیانتی اور بد عنوانی عام ہو جاتی ہے تو دیانتدار، فرض شناس اور اصول پرست لوگوں (یا خصوصیں سرکاری ملازموں) کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا اور کٹھن منزلوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ اپنے رفقائے کار (COLLEAGUES) کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں اور ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ انہیں اس قدر تنگ کیا جائے کہ یا تو وہ اپنی اصول پرستی کو چھوڑ کر انہی کی سی روش اختیار کر لیں اور یا پھر ملازمت چھوڑ جائیں۔ اسی کشمکش میں بعض لوگ جن کی قوتِ یقین و برداشت کمزور ہوتی ہے، دل برداشتہ ہو جاتے ہیں۔ اس کا نقصان صرف انہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس قسم کے دوسرے لوگ بھی اس سے متاثر ہو جاتے ہیں اور اس طرح صداقت، دیانت اور امانت پر چلنے والوں کا دائرہ دن بدن تنگ ہوتا جاتا ہے۔ یہ سب سے بڑا نقصان ہے جو کسی قوم کو اٹھانا پڑتا ہے۔ ان کے برعکس ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اس کشمکش میں بڑی پامردی سے اپنے اصولوں پر قائم رہتے اور تمام مشکلات و مصائب کا مقابلہ عزم، ہمت اور استقامت سے کرتے ہیں اور ان کے پائے ثبات میں ذرا سی لغزش نہیں پیدا ہونے دیتے۔ یہی وہ خوش نصیب حضرات ہیں جن کا کیریکٹر، باطل کی اندوہناک تاریکیوں میں روشنی کے مینار کی طرح جگمگاتا اور مسکراتا ہے اور ہر رہرو حیات کے لئے یقینِ محکم کا سہارا بنتا ہے۔ یہ وہ سعادت مند ہیں جن کی سیرت کی عمارت قرآنی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ ہمارا سرِ نیاز ان کے حضور بصد احترام جھکتا ہے۔

۱۹۵۶ء میں کچھ اسی قسم کے یقین آزما اور ہمت طلب واقعات سامنے آئے جن کے پیش نظر پرویز صاحب نے اپنے خاص انداز میں "سلیم کے نام ایک خط" میں تصویر کے یہ دونوں رخ قرآنی آئینے میں

پیش کئے اور اس سے فضا میں بڑا خوشگوار اثر پیدا ہوا[1]۔ ہم اس خط کو دوبارہ شائع کرنے کی مسرت حاصل کرتے ہیں کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے معاشرہ میں قرآن کریم کی اس راہ نمائی کو بار بار سامنے لانے کی ضرورت ہے وہ خط درج ذیل ہے۔

(۰)

ہاں سلیم! مجھے اس انقلاب کا علم ہے اور تم سے بھی زیادہ علم جو راشد صاحب میں واقع ہوا ہے۔ ان کی تقسیم ہند سے پہلے کی زندگی بھی میرے سامنے ہے اور بعد کی بھی۔ وہ ہندوستان میں بہترین دیانتدار، قابل، محنتی اور فرض شناس افسر تسلیم کئے جاتے تھے۔ انگریز تو ایک طرف، ہندو تک بھی ان کی دیانت اور صداقت کے معترف تھے پاکستان آئے تو قوم کی فلاح و بہبود اور ملک کی خدمت کا بے پناہ جذبہ دل میں لئے ہوئے۔ میں بھی اتفاق سے اسی گاڑی میں سفر کر رہا تھا جس میں وہ کراچی آئے تھے۔ راستہ بھر یہی باتیں ہوتی رہیں۔ انہیں پاکستان سے عشق تھا اس کی تشکیل پر ان کی جبینِ نیاز میں بارگاہِ ایزدی میں شکرانے کے ہزاروں سجدے تڑپ رہے تھے۔ وہ اس پر اس قدر خوش تھے کہ بیان سے باہر ہے۔ وہ کہتے تھے کہ کام تو ہم نے پہلے بھی بڑی محنت اور جانفشانی سے کیا ہے لیکن اب تو "یہ کام کا کام اور جہاد کا جہاد ہے۔ اب اس محنت میں کچھ اور ہی لذت ملے گی۔ غرضیکہ سارا سفر انہی باتوں میں کٹا۔ ان کے ذہن میں بڑی بڑی اسکیمیں تھیں کہ اب یہ کیا جائے گا اور وہ کیا جائے گا۔ چنانچہ یہاں پہنچ کر انہوں نے اپنے پروگرام کے مطابق کام شروع کر دیا اور چند ہی دنوں میں اس کی مثال قائم کر دی کہ محنت اور دیانت۔ فرض شناسی اور احساسِ ذمہ داری۔ جذبۂ خدمت اور جنونِ بہبودِ ملت کسے کہتے ہیں۔ جن حالات میں یہاں دفاتر کے قیام کی ابتدا ہوئی ان کا تمہیں علم ہے۔ نہ میز تھا نہ کرسی۔ نہ کاغذ تھا نہ قلم دوات۔ نہ کوئی خاص عمارت تھی نہ کمرے۔ کسی کو برآمدے میں جگہ ملی ہے تو وہیں بیٹھ گیا نہیں تو باہر درخت کے سائے میں خیمہ (TENT) لگا لیا۔ رہنے کے لئے جگہ کی بھی یہی کیفیت تھی۔ راشد صاحب اُس زمانے میں ڈائرکٹر تھے۔ (اس زمانے کے ڈائرکٹروں کی طرح نہیں تھے کہ ابھی کل کلرک تھے اور آج ڈائرکٹر بن گئے) اُس زمانے میں آئی۔ سی۔ ایس کے کافی سینئر افسر ایسی اسامیوں پر تعینات ہوا کرتے تھے) وہ نئی دہلی میں یوں سمجھو کہ ایک محل میں رہتے تھے۔ یہاں انہیں ایک فلیٹ میں ایک کمرہ مل سکا تھا جس میں کل سامان ایک چارپائی تھا۔ انہوں نے چارپائی پر بیٹھے سوا سولہ گھنٹے روزانہ کام کیا۔ اور نہایت خندہ پیشانی سے کام کیا۔ ان کا تمام سامان دہلی سے آنے والی مال گاڑی میں جل گیا اور گھر بار مشرقی پنجاب میں لٹ گیا۔ لیکن ان کی زبان پر شکایت کا ایک حرف تک نہ آیا۔

---

[1] بعد میں یہ خط "سلیم کے نام خطوط" کے مجموعہ (جلد اول) میں شائع ہوا تھا۔

گورنمنٹ نے کئی بار ان لوگوں سے فہرستیں مانگیں جن کا اس طرح نقصان ہوا تھا لیکن انہوں نے ایک سوئی تک کا مطالبہ نہ کیا۔ حتیٰ کہ اپنے مکان کے بدلے میں کوئی مکان بھی الاٹ نہ کرایا۔ جب بھی اس کا ذکر آتا۔ وہ مسکرا کر کہہ دیتے کہ مجھے تو اللہ نے پھر بھی بہت کچھ دے رکھا ہے۔ یہ انہیں ملنا چاہیے جن بیچاروں کے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔ وہ اس آٹھ نو سال کے عرصہ میں ایسی ایسی اسامیوں پر تعینات رہے جن پر اوروں نے لاکھوں روپے بنا لئے تھے۔ لیکن ان کی یہ حالت کہ کیا مجال جو دفتر کی روشنائی سے بچ کی چھٹی تک بھی لکھی ہو۔ ارباب بست و کشاد کو ان کی دیانت پر اس قدر اعتماد تھا کہ جہاں لوٹ کھسوٹ کا اندھیر مچتا وہاں انہیں پوسٹ کر دیا جاتا۔ اور وہ چند ہی دنوں میں حالات سنوار دیتے۔ لیکن تمہیں معلوم ہے کہ یوں حالات سنوارنے سے خود راشد صاحب کے ساتھ کیا ہوتا؟ ہم از خود شاید اس کا اندازہ نہ لگا سکو۔ اس لئے کہ ان امور کا تعلق "رموزِ سلطنت" سے ہے جنہیں تمہارے جیسا "گداتے گوشہ نشین" سمجھ نہیں سکتا۔ تم جانتے ہو کہ اتنے عرصہ کے حالات کی خرابی سے اب دفاتری کاروبار کے چلنے کی صورت کیا ہو چکی ہے۔ کوئی معاملہ ہو، اس میں حقدار اور غیر حقدار کا سوال ہی نہیں پیدا نہیں ہوتا۔ جو شخص رشوت دینا جانتا ہو جو اثر پیدا کر سکے، جو کہیں سے سفارش لا سکے جو اوپر سے اشارہ کرا سکے، فیصلہ اس کے حق میں ہو جاتا ہے۔ یہ یہاں کے کاروبار کا عام نہج ہے۔ ایسا عام کہ یہ گویا ایک مسلمہ طریق بن چکا ہے۔ اب راشد صاحب کی یہ کیفیت کہ رشوت دینے والا ان کی کوٹھی کے پاس تک نہ پھٹک سکے۔ ہمعصر افسروں میں سے ایک ایک نے سفارش کر کے دیکھ لیا۔ وہاں کسی کی سفارش کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ سیاسی لیڈروں نے (جو رفتہ رفتہ سفارشات اور وزارت کی کرسیوں تک بھی جا پہنچے ہیں) اپنے "حکمنامے" بھیج کر ان کے نتائج دیکھ لئے۔ ارباب حل و عقد نے اپنے "اشاروں" کی ناکامی کے بعد تنگ آ کر یہ سلسلہ بند کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ ہر ایک زبان سے ان کی دیانت کی تعریف کرتا لیکن دل سے چاہتا کہ یہ کانٹا کسی طرح بیچ میں سے الگ ہو تو ان کے کاروبار میں آسانیاں پیدا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی ہمعصر افسروں کو (جو بددیانت بھی تھے اور نالائق بھی، کاہل بھی اور کام چور بھی) اس کا حسد کہ یہ اپنی دیانت اور محنت کی بنا پر عوام میں مقبول کیوں ہے۔ لہٰذا وہ بھی چاہتے کہ انہیں کسی طرح نیچے گرا دیا جائے۔ جب کسی کی مخالفت میں اتنے عناصر یکجا جمع ہو جائیں تو ہمارے معاشرہ میں محض دیانت اور محنت کس طرح اس کی حفاظت کر سکتی ہے؟ نتیجہ یہ کہ پولیس نے چار بازاری غنڈوں کو اپنے ساتھ ملایا اور راشد صاحب کے خلاف رشوت کا مقدمہ کھڑا کر دیا۔ راشد صاحب کو اس کا زعم تھا کہ تمام افسران بالا اور ارباب حل و عقد ان کی دیانت سے باخبر ہیں۔ وہ ان کے کہنے پر بیسیوں مرتبہ جلتی آگ میں کود سے اور وہ کچھ کر کے دکھایا جو کسی کے بس میں نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے سمجھ لیا کہ دو چار آدمیوں کی شرارت ان کا کیا بگاڑے گی؟ لیکن تم یہ سنکر حیران ہو گئے کہ ان سب نے ایک دم آنکھیں پھیر لیں۔ اور راشد صاحب نے چند ہی دنوں میں محسوس کر لیا کہ اس تصادم میں وہ میدان میں بالکل تنہا کھڑے ہیں۔ چنانچہ ان پر چاروں طرف سے بلاؤں نے ہجوم کر دیا۔ ملازمت

سے معطل (SUSPEND) ہو گئے تو روٹی تک کے لالے پڑ گئے۔ مقدمہ کی پیروی کے لئے ہزاروں روپے درکار تھے۔ وہ کہاں سے آتے؟ جب کرسی سے الگ ہوتے تو قریب ترین دوستوں اور ماتحتوں نے رسمی ملاقات تک چھوڑ دی۔ "رشوت" کے الزام سے معاشرہ کی نظروں میں خود بخود مجرم قرار پا گئے اور ساری عزت اور شہرت خاک میں مل گئی۔ وہ جدھر سے نکلتے لوگ ان سے آنکھیں چراتے۔ حتیٰ کہ انہیں یہ بھی محسوس ہونے لگ گیا کہ اگر کل کو اس کی نوبت آگئی تو شاید کوئی ضمانت دینے والا بھی نہ ملے۔

یہ تھے وہ نامساعد حالات جن میں گھرے ہوئے راشد صاحب اُس شام میرے ہاں آئے تھے جس کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا۔ ان کی پریشانی اسی سے ظاہر تھی کہ وہ پہلے بہت کم سگریٹ پیتے تھے لیکن اب کش پر کش لگائے چلے جاتے تھے۔ تم جانتے ہو میرے دل میں ان کے لئے کتنا احترام ہے اس لئے میری ساری ہمدردیاں انکے ساتھ تھیں اور ہوتی کیوں نہ، جب میں جانتا تھا کہ وہ کس قدر مظلوم اور بے گناہ ہیں۔ لیکن میرے لئے ان کی مصیبت سے کہیں زیادہ پریشان کن بلکہ صدمہ کا باعث ان کا وہ ردِّ عمل تھا جو ان حالات کے خلاف ان کے دل سے ابھر رہا تھا۔ انہوں نے پورے جوش اور شدت سے اپنی داستان کو دہرایا اور ایک ایک شخص نے (جس پر انہیں اس قدر بھروسہ تھا) ان سے جس طرزِ عمل کا ثبوت دیا، اسے اس لہجہ سے بیان کیا جس میں مایوسی اور رنج سے کہیں زیادہ غصہ اور انتقام کی جھلک پائی جاتی تھی۔ میں سب کچھ خاموشی سے سنتا رہا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ کس قدر خفی دل کی چیخ و پکار ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ میرے جگر کے پار ہوتا جا رہا تھا۔ جب ان کے جذبات میں زیادہ ہیجان پیدا ہو گیا تو میں نے کچھ کہہ کر انہیں تسلی دلانے کی کوشش کی۔ میں نے ابھی بات شروع ہی کی تھی کہ انہوں نے مجھے ٹوک کر کہا کہ

> معاف کیجئے پرویز صاحب! آپ ایک خیالی دنیا میں بستے ہیں۔ میں اپنے عمر بھر کے تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ دیانتداری اور حق و صداقت کے لئے اس دنیا میں کوئی گنجائش نہیں۔ اس سکہ کا اس بازار میں چلن ہی نہیں۔ انہیں اپنا اصول بنا کر دنیا میں کوئی شخص کامیاب نہیں ہو سکتا۔ میری زندگی کا ایک ایک ورق آپ کے سامنے ہے۔ میں نے پاکستان کے لئے، مسلمانوں کے لئے اور ان میری بڑی بڑی سرکاروں کے لئے جو کچھ کیا ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن مجھے اس دیانت و صداقت، اس محنت اور جاں فشانی کا صلہ کیا ملا؟ یہی کہ جگہ جگہ کے کتے میرے پیچھے چھوڑ دیئے گئے اور جن کی خاطر میں نے یہ سب کچھ کیا ہے، ان میں سے کسی میں اتنی مروت بھی نہیں کہ انہیں محض زبان سے دھتکار ہی دے۔ اس کے بعد آپ مجھے دیانت اور

امانت کا کیا وعظ سنائیں گے! آپ محض وعظ سناتے ہیں اور میں نے اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیا ہے۔ اب میرے سامنے زندگی کا صحیح نقشہ آگیا ہے۔ اب آپ راشد کو ایک مختلف انسان پائیں گے۔ اُف!

دل ایسی چیز کو ٹھکرا دیا نخوت پرستوں نے
بہت مجبور ہو کر ہم نے آئینِ وفا بدلا

میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ (IN ROME DO AS ROMANS DO) چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی۔ دنیا میں رہنے کا یہی ڈھنگ ہے۔

وہ یہاں تک کہنے پائے تھے کہ باہر سے ایک اجنبی آگیا اور یہ سلسلہ کلام منقطع ہو گیا۔ یہ ہیں راشد صاحب کے وہ تاثرات جن کی بنا پر تم بھی کہتے ہو کہ وہ حق بجانب ہیں اور ہمارے پاس ان کی شکایات کا کوئی جواب نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کی شکایات حق بجانب ہیں۔ ایک ایسے معاشرہ میں جو صداقت اور دیانت کی اقدار کا قدر دان ہو ان کی بے لوث خدمات کا صلہ کچھ اور ہونا چاہیئے تھا لیکن اس سے وہ جس نتیجے پر پہنچے ہیں اس سے میں متفق نہیں۔ میں ان کے اس ردِ عمل کو غلط سمجھتا ہوں۔ ایسا غلط کہ مجھے اس کا سخت صدمہ ہے۔ مجھے پہلے اس بات کا افسوس تھا کہ ان ناعاقبت اندیش ارباب بست و کشاد نے اپنی لاابالی سے ایک عمدہ افسر کو ہاتھ سے کھو دیا لیکن راشد صاحب کے ان تاثرات کے بعد مجھے اس کا رنج ہوا کہ ایک عمدہ افسر ہی نہیں انہوں نے ایک قیمتی انسان کو ضائع کر دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس بات کا بھی افسوس تھا کہ راشد صاحب ایک ہی دھچکے میں کہاں سے کہاں آگرے! خدا کرے ان کا یہ ردِ عمل ہنگامی اور عارضی ہو اور وہ اس کے بعد پھر سنبھل جائیں۔ مجھے ان سے اس کی توقع تو بہت ہے، آئندہ خدا جانے!

(۸)

اب میں تمہارے اس سوال کی طرف آتا ہوں کہ ایسے مقامات میں قرآن ہمیں کیا راہ نمائی دیتا ہے۔ اور ان دھچکوں سے بچنے کی کیا صورت بتاتا ہے۔ واضح رہے کہ جو کچھ میں اب کہنے والا ہوں اسے میں نے مختلف نشستوں میں راشد صاحب کے کان میں ڈال دیا تھا۔ اب وہ یہاں نہیں۔ خدا کرے کہ انہوں نے اس کا اثر لے لیا ہو بہرحال تم غور سے سنو! قرآن، سلیم! انسان کو اتنا اونچا لے جاتا ہے کہ وہ ان دھچکوں کی دسترس سے باہر ہو جاتا ہے وہ انسان کو سکھاتا یہ ہے کہ وہ آئینِ وفا کو اس لئے اختیار نہ کرے کہ اسے اس کا "نخوت پرستوں" کی طرف سے کچھ صلہ ملے گا۔ وہ وفا کو وفا کی خاطر اختیار کرے۔ اس کے لئے اس نے ایک ایسا گُر بتایا ہے جو لفظی اعتبار سے جس قدر سمٹا ہوا ہے معنوی اعتبار سے اسی قدر پھیلا ہوا ہے۔ وہ گُر یہ ہے کہ تم جو کام بھی کرو لِلّٰہ (اللہ کے لئے)

یا فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں) کر دیں جانتا ہوں کہ تم یہ الفاظ سنکر جی میں کہو گے کہ میں نے یہ کیا "مولویانہ" سی بات کہہ دی! تم ایسا خیال کرنے میں سچے ہو، اس لئے کہ ہمارے مروجہ مذہب میں یہ الفاظ اپنی حقیقت سے دور ہٹ کر ایسے "عامیانہ" سے ہو گئے ہیں کہ انہیں سنکر ذہن کسی بلند تصور کی طرف منتقل ہی نہیں ہوتا۔ لیکن سلیم! سچ جانو کہ یہ الفاظ انسانی تصور و تخیل کو ان بلندیوں تک لے جاتے ہیں جن سے آگے کوئی اور بلندی نہیں۔ یہ مختصر سے الفاظ بہت بڑی حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ قرآن کی رو سے اللہ کائنات کی تمام مستقل اقدار کا سرچشمہ اور ان صفات کا مظہر ہے جو اپنی قیمت آپ ہیں۔ یعنی ان کی قیمت اضافی (RELATIVE) نہیں بلکہ ذاتی (INTRINSIC) ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس حقیقت کو یوں سمجھو کہ اللہ اس مکمل ترین ذات کا نام ہے جو انسان کی ذات (PERSONALITY) کی تکمیل کے لئے معیار (STANDARD) کا کام دیتی ہے۔ لہٰذا جب کوئی یہ کہے کہ میں یہ کام اللہ کے لئے کرتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں اسے خود اپنی ذات کی تکمیل کے لئے کرتا ہوں، کائنات کی مستقل قدر سمجھ کر کرتا ہوں، اعلیٰ ترین شرفِ انسانیت کا موجب جان کر کرتا ہوں۔ کسی سے صلہ کی امید یا ستائش کی تمنا کی وجہ سے نہیں کرتا۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ قرآن انسان کی وفاشعاریوں (LOYALTY) کو نہ دوسرے انسانوں کے ساتھ وابستہ کرتا ہے اور نہ اضافی قیمتوں کے ساتھ، جو ہر آن تغیر پذیر ہوتی ہیں۔ وہ اسے اس سرچشمہ حسن و خوبی سے وابستہ کرتا ہے جس میں کبھی تغیر نہیں آتا۔ اس لئے اسے کبھی ایسا کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کہ

بہت مجبور ہو کر ہم نے آئینِ وفا بدلا!

اس حقیقت کو قرآن نے اُسوۂ ابراہیمی کے رنگ میں نہایت حسن کارانہ انداز سے پیش کیا ہے سلیم! حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت عجیب و غریب ہے۔ وہ ہم میں کا ایک چلتا پھرتا انسان نظر آتا ہے۔ غمخواریوں کا مجموعہ، شفقتوں کا مجسمہ، محبت کا پیکر۔ انہیں دیکھ کر انسان کا جی ایک دیوتا کی طرح پرستش کرنے کو نہیں، بلکہ ایک ہمدرد دوست اور مشفق بزرگِ خاندان کی طرح محبت کرنے کو چاہتا ہے۔ اللہ نے انہیں خلیل کہہ کر ان کی پوری سیرت کو ایک نگینہ میں سمٹا دیا ہے۔ تم دیکھو کہ سیرتِ ابراہیمیؑ کا ایک ایک نقش کس طرح ہماری راہ نمائی اس بلند نصب العین کی طرف کرتا ہے کہ تمام تغیر پذیر ہستیوں اور اضافی قیمتوں سے ہٹ کر اپنی وفاشعاریوں کو مستقل بلند ترین اقدار کے اس سرچشمہ سے وابستہ رکھو جو تغیرات سے بلند اور حوادثات سے ماوراء ہے۔ غور سے دیکھو کہ ان چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بڑی بڑی درخشندہ حقیقتیں جگمگ جگمگ کر رہی ہیں۔

---(۲)---

حضرت ابراہیمؑ ایک ستارہ پرست قوم میں پیدا ہوتے تھے۔ جب زہرہ ستارے نے سرِ شام نقاب اُٹھا

توحضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اچھا! یہ ہے جس کی طرف تم مجھے دعوت دیتے ہو۔ اور جب وہ چھپ گیا تو آپ نے کہا کہ بس! یہی ہے وہ معبود جو ابھی تھا اور ابھی نہیں رہا۔ اسی طرح چاند اور سورج کے ساتھ ہوا۔ اس مقام پر حضرت ابراہیمؑ نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں وہ حقائق کی ایک دنیا اپنے اندر رکھتے ہیں۔ قرآن میں ہے۔ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ۔ (۶/۷۶) جب وہ ستارہ ڈوب گیا تو آپ نے کہا کہ میں ڈوب جانے والوں کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑنا نہیں چاہتا۔ میں ان سے کوئی امیدیں وابستہ کرنا نہیں چاہتا جن میں ہر آن تغیر ہوتا رہے ——— اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ (۶/۷۹) میں اپنی توجہات کو ہر سمت سے ہٹا کر اس ذات کی طرف مرکوز کرتا ہوں جو تمام کائنات کو عدم سے وجود میں لائی۔ میں سیدھا اس طرف رخ کرتا ہوں۔ اور اس نصب العین میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔

یہ ہے سلیم! اندازِ ابراہیمی۔ انسان کا قبلۂ مقصود آفلین کیوں ہو جو ابھی چمک رہے ہوں اور ابھی ڈوب جائیں۔ وہ اس کی تمناؤں کا مرکز کیوں بنیں؟ ذرا سوچو سلیم! کہ ہماری مایوسیوں اور افسردگیوں کی وجہ یہی نہیں کہ ہم آفلین کے ساتھ توقعات وابستہ کر لیتے ہیں اور جب وہ ڈوب جاتے ہیں تو ہم رونا شروع کر دیتے ہیں۔؟ براہیمی نگاہ ان سب کو پیچھے چھوڑ کر اس مرکزِ حسن و خوبی تک پہنچتی ہے جو تغیرات سے نا آشنا ہے اور وہاں پہنچ کر علی وجہ البصیرت پکار اٹھتی ہے کہ میں نے اپنا رشتہ اس سے جوڑا ہے اَلَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ۔ وَ الَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَ يَسْقِيْنِ۔ وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ۔ وَ الَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ۔ وَ الَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـَٔتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ۔ (۲۶/۷۸-۸۲) جس نے مجھے پیدا کیا اور زندگی کے نصب العین کی طرف راہنمائی کی۔ اور اس کے ساتھ ہی میری طبیعاتی زندگی کی نشوونما کے اسباب بھی بہم پہنچائے۔ اسی کے قانون کے مطابق مرض آتا ہے اور اسی کے مطابق میں شفایاب ہوتا ہوں۔ موت اور حیات بھی اسی کے قانون کے ساتھ وابستہ ہے اور اسی کے قانونِ مکافات سے مجھے توقع ہے کہ وہ میری بھول چوک کے مضر اثرات سے میری حفاظت کا سامان بہم پہنچائے گا۔ دیکھا تم نے سلیم! براہیمی نظر کس طرح تغیر پذیر اسباب و علل سے آگے بڑھ کر براہِ راست خدا کے ابدی قانون تک جا پہنچتی ہے۔ اور اس راستے میں جو جو موانعات حائل ہوتے ہیں انہیں بلا تامل و توقف یکے بعد دیگرے الگ کرتی ہوئی سیدھی اپنے نصب العین کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اگر اس راستے میں باپ حائل ہوتا ہے تو اس سے برملا کہہ دیا ہے کہ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَ لَا يُبْصِرُ وَ لَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا۔ (۱۹/۴۲) تم ایسی چیز کو اپنا معبود کیوں بناتے ہو جو سماعت و بصارت تک سے محروم ہے اور جو تمہارے کسی بھی کام نہیں آ سکتی۔ اور اگر قوم روک بن کر کھڑی ہوتی

ہے تو اس سے بے دھڑک کہہ دیا ہے کہ اِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَ بَدَا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَ الْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ۔ (۶۰/۴) ہم تم سے اور ان سے جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبودیت اختیار کئے ہوئے ہو، بالکل بے تعلق ہیں۔ ہم تمہیں بیزار ہیں، اور ہمارے اور تمہارے درمیان دشمنی اور نفرت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہے گی تا آنکہ تم صرف ایک اللہ پر ایمان نہ لے آؤ۔ حتیٰ کہ اگر اس ملک کا سب سے بڑا اقتدار و قوت کا مالک، مسند بادشاہ بھی ان کے آڑے آتا ہے تو اسے بھی اس طرح جواب دیتے ہیں کہ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ (۲/۲۵۸) وہ ہکا بکا رہ جاتا ہے۔

اس طرح ہر مخالف قوت سے تعلقات منقطع کر لینے کے بعد بھی جب وہ دیکھتے ہیں کہ یہ فضا میرے نصب العین کے حصول کے لئے ناسازگار ہے تو اپنے وطن سے یہ کہہ کر دامن نشاں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں کہ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ۔ (۳۷/۹۹) اور اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ۔ (۲۹/۲۶) لو میں چلا اپنے پروردگار کیطرف۔ تم نے دیکھا سلیم! کہ حضرت ابراہیمؑ کیا کہہ کر وطن سے کنارہ کش ہوتے ہیں؟ یہ کہہ کر کہ "میں اپنے اللہ کی طرف جا رہا ہوں"۔ یہ ظاہر ہے کہ اللہ کا کوئی خاص مقام نہیں ہے۔ وہ ہر مقام پر موجود ہے۔ اس لئے اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سے یہ مطلب نہیں کہ میں کسی خاص مقام کیطرف جا رہا ہوں جہاں مجھے اللہ مل جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ میرا مطلوب و مقصود اللہ ہے۔ اگر یہ فضا اس مقصود کے حصول کے لئے سازگار نہیں تو اس فضا میں میرے لئے کوئی جاذبیت نہیں۔ میں اس فضا کی تلاش میں جا رہا ہوں جو اس مقصد کے حصول کے لئے سازگار ہو۔ وہ وطن چھوڑ کر جاتے ہیں تو اس انداز سے کہ پھر اس کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے۔ حتیٰ کہ انہیں عزیز رشتہ دار آواز دیتے ہیں تو وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ تم میرے نہیں ہو۔ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ (۱۴/۳۶) میرے وہ ہیں جو اس مقصد کے حصول میں میرے پیچھے پیچھے چلتے ہیں جو اللہ کا نہیں وہ میرا کیسے ہو سکتا ہے۔

مجھے بھلا ان سے واسطہ کیا جو اس سے ناآشنا رہے ہیں!

اس طرح وہ دنیا کی ہر آئل آستان سے سرکشیدہ گذرتے چلے جاتے ہیں لیکن جہاں اس تغیر ناآشنا کعبہ مقصود سے آواز آتی ہے تو اس کے سامنے فوراً سر جھکا دیتے ہیں۔ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗ اَسْلِمْ۔ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (۲/۱۳۱) جب اس کے رب نے کہا جھک جا۔ تو اس نے نہایت خندہ پیشانی سے کہہ دیا کہ لیجئے۔ میں "رب العالمین" کے لئے جھک گیا اور ان کا یہ جھکنا دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ ہوتا۔ (اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ۔ ۳۷/۸۳)

تم نے دیکھا سلیم! کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس اطاعت گذاری اور فرماں پذیری کے ساتھ "لرب العالمین" کہہ کر کس طرح نگاہ کو اس بلند حقیقت کیطرف منعطف کر دیا کہ نہ اس (غیر اللہ) سے سرکشی کا جذبہ محرک کسی

سے ذاتی نفرت اور عناد تھا اور نہ اس تسلیم و انقیاد سے مقصود کوئی ذاتی منفعت ہے۔ وہ بھی انسانیت کی بلند اقدار کی خاطر تھا اور یہ بھی اسی مقصد کے لئے ہے۔ چنانچہ جب انہوں نے "دنیا کے بت کدے میں وہ پہلا گھر خدا کا" تعمیر کیا جس کی وجہ سے ان کا نام ابدالآباد تک روشن رہنا تھا تو اس وقت ان کے دل میں یہ جذبہ کارفرما نہیں تھا کہ میں یہ کچھ اپنے کسی مقصد کے لئے کر رہا ہوں۔ اس وقت بھی ان کے لب پر حسین آرزوئیں مسکرا رہی تھیں کہ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۲/۱۲۷) اے ہمارے نشوونما دینے والے! میں اپنی محنتوں کے ماحصل کو تیری بارگاہ میں پیش کرتا ہوں تو اسے شرفِ قبولیت عطا فرما۔ تو الفاظ کو سننے والا اور دلوں کے ارادوں کو جاننے والا ہے اس لئے تجھے معلوم ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں یہ میرے دل کی گہرائیوں سے ابھر رہا ہے تو اسے قبول فرما

کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند

یہ تھے مسلم! پیکرِ خلت و اخلاص، حضرت ابراہیمؑ، جن کے متعلق خدا نے کہہ دیا کہ وہ ایک فرد نہیں تھے۔ ان کی ذات میں پوری کی پوری امت سموئی ہوئی تھی۔ ایسی امت جو اپنا سب کچھ اللہ کے لئے وقف رکھے۔ اس میں کسی اور جذبہ یا مقصد کو شریک نہ کرے۔ اسی کا نام توحید ہے۔ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (۱۶/۱۲۰) ان کی خصوصیت کبریٰ یہ تھی کہ وہ شرک کے مرتکب نہیں تھے۔ وہ اپنی وفا شعاریوں کو کسی آفل کے ساتھ وابستہ نہیں کرتے تھے۔ ستائش کی تمنا اور صلہ کی امید پر نہیں کرتے تھے۔ جو ایسا کرتے ہیں وہ شرک کے مرتکب ہوتے ہیں اور تم جانتے ہو کہ شرک کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ سنو کہ قرآن اسے کن الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ سورہ حج میں ہے وَمَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ۔ جو امرِ عظیم اور بلند نصب العین کے ساتھ کسی اور جذبہ کی آمیزش کرتا ہے اس کی کیفیت یوں سمجھو جیسے کوئی آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پر آ گرے۔ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ۔ اور اسے کوئی شکاری پرندہ یوں اچک لے جائے (جیسے چڑیا کے بچے کو چیل اُچک کر لے جاتی ہے) أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ (۲۲/۳۱) یا اسے ایک پرِ کاہ کی طرح سمجھو جسے ہوا کے جھونکے اڑا کر کہیں کا کہیں پھینک دیں۔

سن رہے ہو مسلم! قرآن کیا کہتا ہے؟ ان الفاظ پر بار بار غور کرو اور دیکھو کہ تمہاری روح کس طرح رقص میں آ جاتی ہے!

(۰)

یہ ہے وہ مسلکِ ابراہیمیؑ جسے قرآن نے اسلام کہہ کر پکارا ہے اور جس کے اتباع کا حکم نبی اکرمؐ اور حضورؐ کی وساطت سے تمام نوعِ انسانی کو دیا ہے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۔ (۴/۱۲۵)

اور اس سے زیادہ حسین مسلک اور کس کا ہو سکتا ہے جس نے اپنے تمام وجدانات و مقاصد کا مرکز اللہ کو قرار دے لیا اور پھر حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کی۔ یہی ہے جو ہر طرف سے منہ موڑ کر مسلک ابراہیمی کی پیروی کرتا ہے۔

اسی کا اعلان نبی اکرمؐ کی زبانِ اقدس سے یہ کہہ کر کرایا گیا کہ

قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۔ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۔ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۔ (۶/۱۶۲)

ان سے کہہ دو کہ میرے پروردگار نے میری رہنمائی صراطِ مستقیم کی طرف کر دی ہے۔ یعنی ابراہیمؑ کے محکم اور متوازن مسلک کی طرف۔ وہ ابراہیم جو ہر طرف سے کٹ کر صرف اللہ کا ہو چکا تھا اور شرک کے پاس تک نہیں پھٹکتا تھا۔

اور اس کے بعد وہ عظیم اعلان ہے جسے میرے نزدیک تمام نوعِ انسانی کا واحد نصب العین اور اسلام کا منشور (MANIFESTO) سمجھنا چاہیئے۔ وہ اعلان یہ ہے کہ

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۔ (۶/۱۶۲،۱۶۳)

حقیقت یہ ہے کہ میرے تمام فرائض زندگی اور ان کے حصول کے طور طریقے (مختصر الفاظ میں یہ کہ) میری زندگی اور میری موت سب اللہ کے لئے ہے جو تمام نوعِ انسانی کی نشوونما کا ذمہ دار ہے۔ میرے اس مقصدِ توحید میں کسی اور جذبہ کی آمیزش نہیں۔ میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔ مجھے اسی مسلک کے اختیار کرنے کے لئے کہا گیا ہے اور میں سب سے پہلے اس کے سامنے اپنا سر جھکاتا ہوں۔

یہ ہے سلیم اسلام اور یہ ہے ایک مسلم کی زندگی کا نصب العین۔ اس کی زندگی کی ہر نقل و حرکت، ہر سعی و کاوش ہر جد و جہد، ہر تگ و تاز کا مقصد ایک اور صرف ایک ہوتا ہے یعنی انسانیت کی بلند اقدار۔ وہ اقدار جن کا سرچشمہ حقیقی اللہ کی ذات ہے۔ وہ ان اقدار کو صرف اس لئے اختیار کرتا ہے کہ اس سے اس کی اپنی ذات، اس سرچشمہ حسن و خوبی کی صفات سے ہم آہنگ ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس کی یہ جد و جہد نہ کسی اور ہستی کے لئے ہوتی ہے نہ کسی دوسرے مقصد کی خاطر۔ اسی لئے اگر اس کی راہ میں مصائب و مشکلات کے پہاڑ آتے ہیں اس

کے دنیاوی رفیق ایک ایک کرکے اس کا ساتھ چھوڑتے چلے جاتے ہیں، تو وہ نہ ان مشکلات سے گھبراتا ہے، نہ ان ساتھیوں کے اس طرزِ عمل سے مایوس ہوتا ہے۔ وہ ان تمام نامساعد حالات کو للکارتا اور دل کے پورے اطمینان سے کہتا ہے کہ ان خطرات و حوادث سے نہ تم میرے رُخ کی سمت بدل سکتے ہو نہ میرے پاؤں میں لغزش پیدا کر سکتے ہو۔ اس لئے کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ (۲/۱۵۶) ہم تو اپنا سب کچھ اللہ کے لئے وقف کر چکے ہیں۔ اس لئے ہمارا ہر قدم اسی کی طرف اُٹھے گا۔ تمہارا جو جی چاہے کر کے دیکھ لو۔ قرآن کہتا ہے کہ

اُولٰٓئِکَ عَلَیْہِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّہِمْ وَ رَحْمَۃٌ ۟ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الْمُہْتَدُوْنَ۔ (۲/۱۵۷)

یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا تحسین و آفرین کے پھول برساتا ہے اور ان کے لئے سامانِ رحمت بہم پہنچاتا ہے۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جو زندگی کے صحیح راستے پر گامزن ہیں۔

وہ کسی انسان سے اپنی توقعات وابستہ نہیں کرتے۔ وہ کسی سے کوئی اجر یا صلہ نہیں مانگتے۔ وہ دیانت اور صداقت کی روش کو صرف اس لئے اختیار کرتے ہیں کہ انسانیت کی یہی صحیح راہ ہے۔ وہ صداقت کو صداقت کی خاطر اختیار کرتے ہیں۔ یہی وہ بلند حقیقت ہے جس کا ہر رسول اپنی دعوت کے آغاز میں یہ کہہ کر اعلان کرتا ہے کہ

فَمَا سَاَلْتُکُمْ مِّنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ۔ (۱۰/۷۲)

میں (تمہارے لئے جو کچھ کرتا ہوں) اس کا کوئی اجر تم سے نہیں مانگتا۔ میرا اجر صرف اللہ پر ہے۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ یہاں قرآن نے کتنی بلند حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ نفسیاتی طور پر کوئی شخص کسی کام کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا جب تک اس کا جذبۂ محرکہ کسی مقصد کا حصول نہ ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ غرض یا مقصد کا پیشِ نظر ہونا کوئی برائی نہیں لیکن تمہارے اغراض و مقاصد دوسرے انسانوں کے ساتھ وابستہ نہیں ہونے چاہئیں۔ یہ اس ذات سے وابستہ ہونے چاہئیں جس کی صفات سے ہم آہنگی تمہاری اپنی ذات کی نشو و نما کی دلیل ہے۔ بالفاظِ دیگر تمہیں ایک بلند قدر کو اس لئے اختیار نہ کرنا چاہیئے کہ اس کا بدلہ لوگوں کی طرف سے ملے گا۔ اسے اس لئے اختیار کرنا چاہیئے کہ وہ قدر اپنے اندر اپنی قیمت آپ رکھتی ہے۔ ذاتی اور خارجی بدلہ کی مثال یوں سمجھو کہ تم کسی قلی سے کہتے ہو کہ وہ تمہارے دوست تک تمہارا خط پہنچا دے (جس کا مکان دو میل کے فاصلے پر ہے)۔ یہ قلی یہ دو میل کا فاصلہ محض اس لئے طے کرتا ہے کہ اسے اس کے بدلے میں آٹھ آنے کے پیسے ملیں گے۔ یہ اس کام کا خارجی بدلہ ہے۔ لیکن جب تم صبح سویرے اٹھ کر دو میل کی سیر کرتے ہو تو اس لئے نہیں کہ تمہیں کہیں سے اٹھنی ملے گی۔ بلکہ اس لئے کہ اس سے تمہاری صحت اچھی ہوگی۔ یعنی یہ دو میل کا سفر اپنی قیمت اپنے اندر خود رکھتا ہے یہی

حقیقت ہے جسے قرآن نے ان الفاظ میں تعبیر کیا ہے کہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے اعمال اپنا بدلہ آپ ہوتے ہیں۔ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۳۴/۳۳) یعنی یہ بدلہ (یا نتیجہ) خود اس عمل کے اندر چھپا ہوتا ہے۔ اسی طرح اہلِ جنت کے متعلق کہا کہ وہ ایک ایسے چشمے سے سیراب ہوں گے۔ يُفَجِّرُونَهَا تَفْجِيرًا (۷۶/۶) جسے وہ خود بہا کر لائیں گے۔ کہیں خارج سے بہتا ہوا نہیں آئے گا۔ یہی مطلب ہے هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ (۵۵/۶۰) کا یعنی حسنِ عمل خود اپنا بدلہ آپ ہے۔ تم نے حسن پیدا کرنا چاہا، حسن پیدا ہو گیا۔ یہی تمہاری کوشش کا بدلہ ہے۔ تم نے دیکھا سلیم! قرآن انسان کو کس بلند مقام پر لے جاتا ہے۔ وہ حسنِ عمل کے بدلہ کے لئے کسی انسان کی طرف رُخ ہی نہیں کرنے دیتا۔ اسی لئے وہ دنیا شعاریوں کا مرکز کسی انسان کو قرار نہیں دیتا۔

آخر میں سلیم! میں ایک ایسی بلند حقیقت تمہارے سامنے لانا چاہتا ہوں جو اس باب میں فی الحقیقت حرفِ آخر ہے۔ ہم میں سے جو لوگ نیک کام کسی دنیاوی غرض کے لئے یا کسی دوسرے انسان کی خاطر نہیں کرتے، ان کا مقصد حصولِ جنت ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایمان و اعمالِ صالحہ کا فطری نتیجہ جنت ہے اور یہ بہت بڑی (ACHIEVEMENT) ہے لیکن قرآن انسان کو اس سے بھی اونچا لے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جنت بے شک بہت بڑا صلہ ہے لیکن حسنِ عمل سے ایک چیز اور حاصل ہوتی ہے جو اس سے بھی بڑی ہے۔ وہ کیا ہے؟ ذرا غور سے سنو! سورۂ توبہ میں ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ
خٰلِدِينَ فِيهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنّٰتِ عَدْنٍ ۔

مومن مردوں اور عورتوں سے اللہ نے اس جنت کا وعدہ کر رکھا ہے جس کی شادابیوں میں کبھی کمی نہیں آسکتی۔ ان پُر آسائش باغات میں وہ خوشگواریوں کی زندگی بسر کریں گے۔

بیشک یہ ان کے حسنِ عمل کا بہت بڑا ثمر ہے لیکن وَرِضْوَانٌ مِنَ اللّٰهِ أَكْبَرُ۔ اس سے کہیں بڑا صلہ یہ ہے کہ وہ اللہ کی صفات سے ہم آہنگ ہو جائیں گے۔ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ۔ (۹/۷۲) یہ ہے سب سے بڑی کامیابی۔ "اللہ کی ذات سے ہم آہنگی" سے مطلب یہ ہے کہ جس مکمل ترین۔ بلند ترین اور حسین ترین ذات کو انہوں نے اپنی تکمیل کے لئے نصب العین بنایا تھا، اس کی صفات (بشریت کی حدود کے اندر) ان کی اپنی ذات میں منعکس ہو جائیں گی۔ اس حد تک ان دونوں میں ہم آہنگی ہو جائے گی۔ اور چونکہ مقصود بالذات، اس مقام کا حصول تھا (یعنی مستقل اقدار سے موافقت و مطابقت) نہ کہ جنت۔ اسلئے یہی لوگ ہیں جو اپنی مراد کو پہنچیں گے۔

تم نے دیکھا سلیم! کہ قرآن حسنِ عمل کے لئے کس مقصد کو جذبۂ محرکہ قرار دیتا ہے جس انسان کے

معاشرے یہ حقیقت ہو وہ ان بلند اقدار انسانیت کو حصولِ جنت کے لئے بھی اختیار نہیں کرتا بلکہ اپنے آپ کو ان اقدار کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے اختیار کرتا ہے۔

جب انسان کی نگاہ میں اس قسم کی تبدیلی آجائے تو خارجی سہارے ہزار ٹوٹتے رہیں اس پر کبھی مایوسی طاری نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ ۚ لَا انفِصَامَ لَهَا (۲/۲۵۶) اس نے ایک ایسا محکم سہارا اتھام رکھا ہوتا ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ اگر ہم دیانت کو دیانت کے لئے اختیار کریں تو ہمیں اس کی پرواہ ہی نہیں ہوتی کہ دوسرے اس کے جواب میں کیا کرتے اور کیا کہتے ہیں۔ اگر ہم صداقت پر صداقت کے لئے قائم رہیں تو ہمیں اس کا خیال بھی نہیں گزرے گا کہ ہمیں اس کا صلہ کیا ملتا ہے۔ اگر ہم وفا کو وفا کے لئے اختیار کریں تو ہمارے سامنے کوئی حادثہ ایسا نہیں آسکتا جس سے ہم آئینِ وفا بدلنے پر مجبور ہو جائیں۔

سوچو سلیم! کہ جس معاشرے میں افراد ان بلند اقدار انسانیت کو محض ان اقدار کی خاطر اختیار کریں اس معاشرہ میں زندگی کس قدر حسین ہوگی۔ طوبیٰ لھم وحسن مآب۔

اب بتاؤ کہ تم راشد صاحب کے اس ردعمل کو کس حد تک حق بجانب سمجھتے ہو؟

والسلام - پرویز

(۶)

مکرر: میں یہ خط لکھ چکا تھا کہ مجھے راشد صاحب کا خط موصول ہوا۔ اور تم یہ سنکر خوش ہو گے کہ میں نے ان سے جو توقعات وابستہ کی تھیں وہ غلط ثابت نہ ہوئیں۔ وہ اپنے خط میں تمہیدی فقرات کے بعد لکھتے ہیں:-

مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس دن آپ کی بات کو عجیب بے ہنگم طریق سے کاٹ دیا۔ اور اس کے بعد بھی آپ دفعتاً فوقتاً جو کچھ کہتے رہے اسے بھی بے رغبتی اور بے التفاتی ہی سے سنتا رہا۔ میں اس کے لئے اس سے زیادہ اور کسی معذرت کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ میں ان دنوں جن حالات سے گذر رہا تھا، ان میں جذبات پر قابو رکھنا میرے بس کی بات نہیں رہی تھی بالآخر دل ہی تو تھا نہ سنگ و خشت۔ لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی میری کمزوری تھی۔ مجھے اس کی بڑی خوشی ہے کہ جو کچھ آپ مجھ سے دفعتاً فوقتاً کہتے رہے اسے اگرچہ میں نے بے التفاتی سے سنا لیکن وہ غیر شعوری طور پر میرے دل کی گہرائیوں میں اتر گیا اور اب جب کہ ان جذبات کا طوفان ختم ہو گیا ہے۔ ان کی صداقت ایک ایک کر کے میرے سامنے آرہی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں نے اس سے پہلے بھی جو کچھ کیا تھا کسی ستائش کی تمنا یا صلہ کی امید سے نہیں کیا تھا۔ اب میں اس جگر خراش واقعہ کے بعد بھی آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اسی مسلک پر قائم رہوں گا۔ اس حادثہ

ہیں جن دوستوں نے مجھے ہمدردی کا ثبوت دیا ہیں ان سب کا سپاس گذار ہوں لیکن ان میں سب سے زیادہ شکریہ کے مستحق آپ ہیں، اس لئے کہ آپ نے اس دشوار گذار راستہ میں میرا ہاتھ اس طرح تھاما کہ اس سے میرے پاؤں میں لغزش تک نہیں پیدا ہونے دی۔ اگر آپ ایسا نہ کرتے تو (یہ حادثہ تو گذر ہی جاتا لیکن) میں ایک مختلف انسان ہو جاتا۔ اور یہ نقصان ایسا ہوتا جس کی تلافی کسی صورت میں بھی ممکن نہ تھی۔ آپ کا یہ احسان بہت بڑا احسان ہے اور اس سے بھی زیادہ بڑا احسان یہ کہ اس ضمن میں آپ نے جن قرآنی حقائق کو بے نقاب کیا، ان سے میرا یہ مسلک علیٰ وجہ البصیرت مسلکِ حق و صداقت قرار پا گیا۔

مجھے راشد صاحب سے اسی کی توقع تھی۔ کس قدر بلند ہیں یہ انسان جو قرآن کا اثر اس طرح سے لیتے ہیں۔ قرآن فی الواقعہ ایسا ہی انقلاب پیدا کرتا ہے۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

اور قرآن کی رو سے ہر عمل کا محور یہی نقطہ توحید ہے کہ جو کچھ کیا جائے للہ کیا جائے یعنی انسانیت کی بلند اقدار کے سرچشمہ کی صفات سے ہم آہنگی کی خاطر۔ اسی کو ہماری تمام وفاشعاریوں کا مرکز ہونا چاہیئے۔ اس میں نہ کسی حاجت (درستائش) کا خیال جذبۂ محرکہ ہونا چاہیئے نہ ہی کسی شخصیت کا پاس، خواہ وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو۔

سوچو سلیم! کس قدر جنت بداماں ہو گا وہ معاشرہ جس میں فرائض کی انجام دہی کا مرکز یہ تصور ہو اور نوعِ انسانی کے لئے کس قدر باعثِ رحمت۔ اور پھر اس پر بھی غور کرو کہ ایک زاویۂ نگاہ کے بدل جانے سے کس طرح خارجی دنیا میں انقلاب واقع ہو جاتا ہے۔ زاویۂ نگاہ کی اسی تبدیلی کا نام قرآن کی اصطلاح میں ایمان ہے۔ یہ وجہ ہے کہ وہ ہر عمل کی بنیاد ایمان پر رکھتا ہے تاکہ یہ عمارت اس قدر محکم ہو کہ خارجی حوادث اس پر کسی طرح اثر انداز نہ ہو سکیں۔ اب تم سمجھے کہ ایمان کسے کہتے ہیں اور اس کا عمل سے کیا تعلق ہے؟

اکتوبر ۱۹۵۶ء والسلام! پرویز

(۰)

خط تو یہیں تک تھا، لیکن پرویز صاحب نے اگلے دنوں اپنے ایک درس میں ایک ایسے نکتہ کی وضاحت کی جو اس باب میں حقیقتوں کے ایک عظیم گوشے کو بے نقاب کرتا ہے۔ قرآن کریم کی یہ آیت سامنے آئی۔ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ ۖ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ (۵/۱۰۵) اے اربابِ ایمان! تم

اپنی ذات کا خیال رکھو۔ اگر تم سیدھے راستے پر چلتے جاؤ گے تو غلط راہ پر چلنے والے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے (انہوں نے کہا کہ ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ دیانت اور امانت کے مطابق زندگی بسر کرنے والوں کو غلط کار اور بدقماش لوگ طرح طرح کے نقصانات پہنچاتے رہتے ہیں۔ پھر خدا کی اس یقین دہانی سے مراد کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ انسانی زندگی کی دو سطحیں ہیں۔ ایک طبیعی زندگی اور دوسری اس کی ذات (جسے قرآن نفس کہہ کر پکارتا ہے) جہاں تک انسان کی طبیعی زندگی کا تعلق ہے وہ طبیعی قوانین کے تابع رہتی ہے۔ اور طبیعی قوانین کے دائرہ کار میں مومن کافر یا نیک اور بد کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ سنکھیا نیکوکار انسان کھا لے یا بدکردار، دونوں پر یکساں اثر پڑے گا۔ سیلاب کی زد میں مسجد آجائے یا "بت خانہ" وہ دونوں کو بہا کر لے جائے گا۔ ان طبیعی نقصانات سے وہی بچ سکیگا جو ان سے حفاظت کی طبیعی تدابیر اختیار کرے۔ لیکن ان کی "ذات" طبیعی قوانین کے تابع نہیں۔ اس کا تعلق مستقل اقدار سے ہے۔ ان اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسانی ذات کو نفع پہنچتا ہے اور ان کی خلاف ورزی سے اسے نقصان ہوتا ہے۔ اور یہ ہر فرد کے اپنے اختیار و ارادہ کی بات ہے کہ وہ مستقل اقدار کے مطابق قدم اٹھاتا ہے یا ان کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ اس میں کوئی دوسرا شخص دخل نہیں دے سکتا۔

اب اگر ایک شخص دیانتداری کی زندگی بسر کرتا ہے تو غلط معاشرہ میں اُسے بہت سے نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔ لیکن ان نقصانات کا تعلق اس کی طبیعی زندگی تک محدود ہوتا ہے۔ اُسے مالی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ وہ زندگی کی بہت سی سہولتوں سے محروم ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسے قید و بند کے مصائب میں بھی مبتلا ہونا پڑے اور بعض اوقات جان تک دے دینے کی بھی نوبت آجائے۔ لیکن ان تمام نقصانات کا تعلق اس کی طبیعی زندگی تک محدود ہے۔ اس کی ذات کو اس سے کچھ نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن اگر وہ بددیانت ہو جاتا ہے تو اس سے (اسے طبیعی مفاد تو حاصل ہو جاتے ہیں لیکن) اس کی ذات کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اسے طبیعی نقصانات تو دوسرے لوگ پہنچا سکتے ہیں لیکن اس کی ذات کو کوئی دوسرا شخص نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اسے وہ خود ہی نقصان پہنچاتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں بیشمار مقامات پر کہا گیا ہے کہ کانُوٓا اَنفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ۔ اپنی ذات پر لوگ آپ ہی زیادتی کرتے ہیں، کوئی دوسرا ایسا نہیں کرتا۔ ساحرین دربار فرعون جب فرعون کے غیض و غضب کے علی الرغم، خدا پر ایمان لے آئے تو ان سے اس نے بپھرے ہوئے شیر کی طرح دھاڑتے ہوئے کہا کہ تم دیکھو کہ میں تمہارا کیا حشر کرتا ہوں۔ میں تمہارے بدن کا ایک ایک عضو کاٹ کر الگ الگ کر دوں گا۔ میں تمہیں سولی پر لٹکا دوں گا کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ میں کتنی بڑی قوتوں کا مالک ہوں اور میری عقوبت کیسی شدید اور الم انگیز ہے (۲۰/۷۱)۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کے جواب میں ان مردانِ مومن نے کیا کہا تھا۔ انہوں نے اس گرج کو نہایت اطمینان اور سکون سے سنا اور مسکراتے ہوئے کہا کہ فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ۔

تو جو تیرے جی میں آئے کرلے۔ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا۔ (۲۰/۷۲) تیرا دائرۂ اختیار صرف ہماری طبیعی زندگی تک ہے۔ اس سے آگے تیری دسترس ہی نہیں۔ تو ہمیں صرف طبیعی نقصانات پہنچا سکتا ہے۔ ہماری ذات تک تیرا ہاتھ پہنچ ہی نہیں سکتا۔ تو زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہے کہ ہماری جان لے لے۔ تو جان بھی تو طبیعی دائرے کی چیز ہے۔ اس سے زیادہ تو کر ہی کیا سکتا ہے۔

یہ ہوتی ہے کیفیت ان سعادت مند حضرات کی جو ایمان کی قوتوں سے بہرہ یاب ہوں — ایمان کس بات پر؟ اس بات پر کہ انسانی زندگی طبیعی حدود تک محدود نہیں۔ ان حدود سے آگے ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ اور انسانی ذات کو کوئی دوسرا شخص نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اسے انسان خود ہی نقصان پہنچاتا ہے۔ اسی لئے قرآن کہتا ہے کہ عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ۔ تم اپنی ذات کی نگہداشت کرو۔ اس کی احتیاط برتو کہ تم خود اسے کوئی نقصان نہ پہنچا لو۔ اگر تم نے اس کی احتیاط برت لی تو غلط معاشرہ اور اس میں بسنے والے بدقماش لوگ (تمہاری اضافی چیزوں کو تو نقصان پہنچا سکیں گے) تمہیں (یعنی تمہاری ذات کو) کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔

اور ظاہر ہے کہ جس شخص کا ایمان یہ ہو وہ طبیعی نقصانات کے ڈر سے اپنی اصول پرستی کو چھوڑے گا کیوں؟

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ غلط معاشرہ میں جب بددیانتی اور بے عنوانی عام ہو جائے اور دیانت و امانت پر قائم رہنے سے طرح طرح کے نقصانات و مضرات کا احتمال ہو، ایک انسان کو دیانت و امانت پر پابند، یہی ایمان رکھ سکتا ہے۔

خوش بخت ہیں وہ جنہیں آج کے معاشرہ میں — جب کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ ظهر الفساد فی البر والبحر۔ کوئی شے اپنے مقام پر قائم ہی نہیں رہی، ہر جگہ فساد ہی فساد رونما ہو چکا ہے — اس قسم کا ایمان نصیب ہے۔ اور بفضلہ الحمد کہ ان کا وجود آج بھی عنقا نہیں۔ طوبیٰ لھم وحسن مآب!

پیشگی خریداری

آپ ایک روپے کی کتاب منگواتے ہیں تو اس پر کم از کم بارہ آنے ڈاک کے خرچ آجاتے ہیں۔ اگر آپ اپنے آپ کو پیشگی خریداروں کی فہرست میں شامل کرلیں تو آپ کا یہ سارا خرچ بچ سکتا ہے۔ اس کے لئے صرف اتنا کرنا ہوگا کہ آپ مبلغ ایک سو روپیہ پیشگی جمع کرا دیں۔ اس کے بعد آپ جو کتاب طلب فرمائیں گے وہ (بغیر ڈاک خرچ) آپ کو بھیج دی جائیگی۔ رسالہ طلوع اسلام کا چندہ بھی اسی سے وضع کر لیا جائے گا اور آپ کا حساب باقاعدہ آپ کو بھیجا جاتا رہے گا۔

(ناظم ادارہ طلوع اسلام)

پاکستان کا مطلب کیا؟

۱۱/ اپریل ۱۹۷۰ء کی شام (سات بجے) بزمِ طلوعِ اسلام لائلپور کے زیرِ اہتمام میونسپل ہال لائلپور میں ایک جلسۂ عام ہوا جس میں پرویز صاحب نے عنوانِ بالا پر ایک جامع تقریر فرمائی۔ تقریر برجستہ تھی جسے بعد میں نوٹس سے مرتب کیا گیا اور اب پیشِ خدمتِ قارئین ہے۔ ویسے اس اہم خطاب کو ٹیپ ریکارڈر میں محفوظ بھی کر لیا گیا ہے۔ (طلوعِ اسلام)

صدرِ محترم، میری عزیز بہنو اور بھائیو! سلام و رحمت!

آپ ہندی مسلمانوں کی سیاسی زندگی پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالئے۔ اگر آپ اس مطالعہ کا آغاز ۱۹۱۲-۱۳ء کی جنگِ بلقان سے کریں، اس کے ساتھ ساتھ (مثلاً) ۱۹۳۵-۳۶ء تک بھی چلتے آئیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ ایک قوم نہیں تھی، شعلہ جوالہ تھی جو ذرا ذرا سے اشتعال پر یوں بھڑک اٹھتی تھی کہ سارا ماحول اس کی لپیٹ میں آ جاتا تھا لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس کی شعلہ فشانیاں ختم ہو جاتی تھیں اور دیکھنے والی آنکھیں دیکھتی تھیں کہ اس کی ان شرر باریوں سے ماحول میں تو کم تبدیلی آئی ہے لیکن یہ خود راکھ کا ڈھیر بن گئی ہے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہی راکھ کا ڈھیر، ایک جھکڑ بن کر اٹھتا اور ساری فضا میں طوفان برپا کر دیتا۔ اس طوفان بلا کی تیزیوں اور برق رفتاریوں سے یوں نظر آتا جیسے وہ اس جہانِ ناسازگار کے محکم ترین حصاروں کی بنیادوں تک کو ہلا کر انہیں خس و خاشاک کی طرح نذرِ باد کر دے گی۔ لیکن اس کے بعد دکھائی یہ دیتا کہ یہ طوفان انگیزیاں بس ایک بگولے کا رقص تھا جو اپنے ہی گرد گھوما اور خود ہی تھک کر خاموش ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد اس کی خاموشی، وہ سکوت ثابت ہوتی جو سمندر میں تلاطم خیزیوں کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اس کے بحرِ مواج سے بلا انگیز موجیں اٹھتیں اور یوں نظر آتا گویا اس جہانِ پیر کی موت قریب آگئی ہے اور اس سیلِ بے پناہ

شورش انگیزیاں

کے سامنے اس کی حیثیت حباب سے زیادہ کچھ نہیں ہوگی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد یہ آسمان بوس موجیں باہمدگر ٹکرا کر غرقِ دریا ہو جاتیں اور سطحِ آب پر ان کا نقشِ قدم تک نظر نہ آتا۔ اس قوم کی یہ سیمابی کیفیت اس لئے تھی کہ اس کی رگوں میں خون نہیں جذبات کی بجلیاں دوڑ رہی تھیں لیکن اس کے سامنے نہ کوئی واضح نصب العین تھا نہ متعین مطمحِ نگاہ۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ان کے پاؤں چلتے تھے لیکن منزل قریب نہیں آتی تھی (واسطے کہ ان کے سامنے منزل تھی ہی نہیں) ان کے ہاتھ اٹھتے تھے لیکن کسی عمل تک ان کی رسائی نہیں ہوتی تھی (کہ عمل کا انہوں نے تعین ہی نہیں کیا تھا)۔ اقبالؒ نے ان کی ان بے منزل صحرا نوردیوں اور بلا مقصد دشت پیمائیوں کا نقشہ ان چار الفاظ میں کھینچ کر رکھ دیا تھا جب کہا تھا کہ ــــــ دلے دارند و محبوبے ندارند ــــــ اس احساس کے ماتحت اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے مقام پر اپنے عدیم النظیر خطبہ میں پہلی بار اس آہوئے رم خوردہ کے لئے منزل کا تعین کیا لیکن قوم جذبات کے ہجوم میں اس قدر کھوئی ہوئی تھی کہ کسی نے اس رازدانِ راہِ حیات کی اس پکار کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ اور اسے ایک شاعر کا تخیل یا دیوانے کا خواب کہہ کر حوالۂ طنز و مزاح کر دیا اور خود پھر انہی ہنگامہ خیزیوں اور شورانگیزیوں میں مصروف ہو گئی۔

علامہ اقبالؒ کا پیغام

۱۹۳۲ء میں جب علامہ اقبالؒ کو آل انڈیا مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس (منعقدہ لاہور) کا صدر منتخب کیا گیا تو انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت کے آغاز میں قوم کی اس ہنگامہ خیز جذباتیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ملک کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ ایک طرف سے ہمارے کان میں یہ آواز آتی ہے کہ

> اگر ان حالات میں ہمارے لیڈروں نے قوم کے لئے کوئی متعین راہِ عمل تجویز نہ کی تو اس وقت دوسروں کی نقالی سے جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ رنگ لا کر رہے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قوم کا نوجوان طبقہ حوادث کے سیلِ بے پناہ میں بلا سوچے سمجھے کود جائے گا۔

اور دوسری طرف سے "ایک نوجوان" انتہائے جوش و خروش میں یہ پکارتا ہوا آگے بڑھتا ہے کہ:-

> عمل کے لئے کسی متعین راستے اور سوچے سمجھے منصوبے کی ضرورت نہیں۔ یہ سبق درسگاہوں کی منطق میں نہیں پڑھایا جا سکتا۔ یہ جذبہ جب دل کی گہرائیوں سے ابھر کر فضا میں پھیل جاتا ہے تو اپنی منطق آپ مرتب کر لیتا ہے۔

اس کے بعد حضرت علامہؒ نے فرمایا کہ

> ان شورانگیزیوں میں آپ نے اس اجتماع کی صدارت کے لئے ایک مفکر کا انتخاب کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے ایسا اس لئے کیا ہے کہ آپ کو اس امر کا احساس ہوا ہے

کہ ایسے وقت میں قوم کو ایک مفکر کی ضرورت ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ جس قوم میں
فکر کی صلاحیت نہیں رہتی وہ تباہ ہو جاتی ہے۔

یہ ایک عظیم حقیقت ہے جسے علامہ اقبالؒ نے اپنے مخصوص سمٹے ہوئے انداز میں چند الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ قومیں نہ افراد کی قلت سے تباہ ہوتی ہیں، نہ ساز و سامان کی کمی سے۔ قومیں اس وقت تباہ ہوتی ہیں جب ان کی قوتِ فکر پر جذبات غالب آجاتے ہیں اور وہ ایک متعین مقصد کے لئے، ایک سوچے سمجھے لائحہ عمل کے مطابق، ایک طے شدہ منزل کی طرف گامزن ہونے کے بجائے ہنگامہ خیزیوں میں مصروف ہو جاتی ہیں اور اپنے وقت، دولت اور توانائی کے اس قدر بے محابا ضیاع کا نام عمل رکھ کر اس فریب میں مبتلا ہو جاتی ہیں کہ ہم بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے رہی ہیں۔

عزیزانِ گرامی قدر! علامہ اقبالؒ نے جن حالات میں اس عظیم حقیقت کو قوم کے سامنے واشگاف کیا تھا، آج ہماری فضا اس سے کہیں زیادہ آتش خیز اور شعلہ بیز ہو رہی ہے۔ اس وقت قوم کے جذبات کو اس حد تک مشتعل کر دیا گیا ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کے لئے بھی آمادہ نہیں جو اس سے یہ کہے کہ ذرا رک کر میری بات سن لو۔ لیکن عزیزانِ من! میں قرآن کریم کا ایک ادنیٰ سا طالب علم ہوں اور قرآن مجھ سے پکار پکار کر یہ کہتا ہے کہ ان حالات میں، قرآن کی طرف دعوت دینے والوں پر یہ فریضہ اور بھی زیادہ شدت سے عاید ہو جاتا ہے کہ وہ اس فکر کو زیادہ بلند آواز سے عام کریں۔ ایسے ہی تھے وہ حالات جن میں، بلند ترین فکر کی طرف دعوت دینے والی، کائنات کی بلند ترین ہستی — حضور خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا تھا کہ (قُلْ) ان سے کہہ دو کہ — اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ — میں تمہیں کوئی لمبی چوڑی نصیحتیں نہیں کرنا چاہتا۔ تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ صرف ایک بات — اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى — وہ بات ایسی نہیں کہ تم اسے یونہی چلتے چلتے سن لو۔ وہ بڑی اہم بات ہے۔ اسے کھڑے ہو کر سننا ہوگا۔ خواہ تم میں سے ایک ایک دو دو ہی کھڑے کیوں نہ ہو جائیں۔ بس کھڑے ہو کر میری بات گوشِ ہوش سے سن لو — اور آپ کو معلوم ہے عزیزانِ من! کہ وہ ایک بات کیا تھی جسے اس قدر سکون اور سکوت کے ساتھ سننے کی دعوت دی گئی اور تاکید کی گئی تھی۔ سنیئے اور نہایت غور سے سنیئے۔ وہ بات یہ تھی کہ — تَتَفَكَّرُوْا (۳۴/۴۶) — تم سوچا کرو۔ یونہی جذبات کی رو میں نہ بہے چلے جایا کرو۔ سوچ سمجھ کر اپنے لئے منزل کا تعین کرو اور پھر نہایت تدبر و خوض سے اس منزل تک پہنچنے کا پروگرام مرتب کرو اور اس کے مطابق نہایت سکون و ثبات سے قدم بڑھاتے، جانبِ منزل، رواں دواں چلتے جاؤ۔ طُوْبٰى لَكُمْ وَحُسْنُ مَاٰب۔ خوشگواریاں آگے بڑھ کر تمہارے قدم چومیں گی اور عروسِ منزل آغوش وا کئے،

تَتَفَكَّرُوْا

تمہارے استقبال کے لئے دیدہ و دل فرشِ راہ کئے ہوگی۔ عزیزانِ من! میں آپ کی خدمت میں قرآنِ کریم کا یہی پیغام پہنچانے کے لئے حاضر ہوا ہوں کہ تَتَفَکَّرُوْا۔ آپ حالات کی گرمجوشیوں اور ہنگامہ خیزیوں سے الگ ہو کر نہایت سکون و سکوت سے سوچیں کہ ہمارا منزل کیا ہے اور مقصود کیا جس کے لئے ہم اس طرح دیوانہ وار مصروفِ تگ و تاز ہیں۔ اگر آپ نے سوچنے کے لئے تھوڑا سا وقت بھی نکال لیا تو میں سمجھوں گا کہ مجھے میری کاوشوں کا صلہ مل گیا۔ علامہ اقبالؒ نے ہنگامہ خیزیوں کی انہی آندھیوں میں کھڑے ہو کر اپنے متعلق کہا تھا کہ

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

اس کے بعد اقبالؒ نے اس چراغ کو اُس رہبرِ فرزانہ کے ہاتھوں میں دے دیا جس کی ناخدائی میں کشتیٔ ملت ایک حسین بط کی طرح نہایت سکوت اور اطمینان سے تیرتی ہوئی ساحلِ مراد تک جا پہنچی۔

میرا پیغام

مجھے نہ اقبالؒ کا سا مفکر ہونے کا دعوےٰ ہے اور نہ ہی قائدِ اعظم جیسا مدبر ہونے کا مدعی۔ لیکن قرآن کے ایک طالب علم کی حیثیت سے، اتنا کہنے کی جرأت ضرور کروں گا کہ جن حالات سے اس وقت قوم گذر رہی ہے ان میں

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

امید ہے آپ عشق کے اس دردمند کی صدائے دلسوز کو سکوت و سکون سے سننے کی زحمت گوارا فرمائیں گے!

اس مقام پر میں اتنا اور واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرا تعلق نہ کسی مذہبی فرقہ سے ہے اور نہ ہی کسی سیاسی پارٹی سے۔ حتےٰ کہ میں عملی سیاسیات میں بھی حصہ نہیں لیتا۔ میں نے اپنی عمر قرآنِ مجید پر غور و فکر میں بسر کی ہے۔ میں زندگی کے ہر معاملہ کا جائزہ اسی کی روشنی میں لیتا ہوں اور جو کچھ اپنی بصیرت کے مطابق صحیح سمجھتا ہوں اُسے قوم کے سامنے پیش کر دیتا ہوں۔ اس لئے میں جو کچھ عرض کروں گا اگر وہ کسی کے مسلک یا موقف کے خلاف جائے تو اسے ذاتی تنقید یا پارٹی بازی کی تنقیص پر محمول نہ کیا جائے۔ قرآنی بصیرت پر مبنی بے لاگ تبصرہ سمجھا جائے۔

(۰)

عزیزانِ من! آپ نے اشتہار میں لکھا دیکھا کہ آج شام میونسپل ہال میں جلسہ ہوگا۔ چونکہ میونسپل ہال مفہوم آپ کے ذہن میں متعین تھا اس لئے آپ میں سے ہر ایک کا قدم سیدھا اس کی طرف اٹھتا چلا آیا اور اس میں کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوئی۔ لیکن اگر اعلان میں صرف اتنا ہی کہا گیا ہوتا کہ آج شام ہال میں جلسہ

ہوگا تو سوچیے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا۔ سارے شہر میں بحث و تکرار شروع ہو جاتی کہ جلسہ کہاں ہوگا۔ کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ۔ کسی کا قدم ایک طرف کو اٹھتا کسی کا دوسری طرف کو اور اس سے خود جلسہ کا بھی جو حشر ہوتا وہ ظاہر ہے۔ آپ اس مثال کو ذرا آگے بڑھا لیجئے۔ آج پاکستان کی ہر پارٹی۔ ہر گروہ۔ ہر فرد کی زبان پر ہے کہ اس مملکت کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اس لئے یہاں اسلامی نظام قائم ہوگا۔ ہر پارٹی کا دعویٰ ہے کہ وہ اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے میدانِ سیاست میں اتری ہے۔

اسلامی نظام کا دعوے

ہر ایک کے منشور میں اس کا ذکر موجود ہے۔ ہر لیڈر کی تقریر میں اسے دہرایا جاتا ہے۔ ہر اخبار میں شہ سرخیوں کے ساتھ اسے چھاپا جاتا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ ملک کے ہر فرقہ۔ ہر پارٹی۔ ہر گروہ۔ ہر لیڈر بلکہ ہر فرد کا مطمح نگاہ ایک ہے مقصود و مطلوب ایک ہے۔ منتہیٰ ایک ہے۔ منزل ایک ہے یعنی اسلامی نظام کا قیام۔ اور اس کے بعد حالت یہ ہے کہ ہر فرقہ دوسرے فرقہ کے ساتھ دست و گریباں ہے۔ ہر پارٹی دوسری پارٹی کے خلاف نبرد آزما ہے۔ ہر لیڈر دوسرے لیڈر سے برسرِ پیکار ہے۔ ہر فرد دوسرے فرد سے الجھ رہا ہے۔ سارا ملک تشتت و انتشار کی آماجگاہ بن رہا ہے۔ ساری قوم گویا میدانِ کارزار میں اتری ہوتی ہے۔ آپ سوچئے کہ کیا اس بات کا کبھی تصور تک بھی کیا جا سکتا ہے کہ کسی قوم کے سامنے نصب العین ایک ہو، مقصود و مطلوب ایک ہو، اور پھر ساری قوم ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہو! ایسا کیوں ہے؟ صرف اسلئے کہ قوم نے سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ اگر قوم سوچتی تو وہ ہر دعویٰ کرنے والے سے پوچھتی کہ ہمیں متعین طور پر بتایئے کہ اسلامی نظام سے آپ کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مفہوم کیا ہے، اس کا واضح اور متعین نقشہ کیا ہے۔ اس کے حدود کیا ہیں۔ اس کے نقوش کیا ہیں۔ اور پھر سوچتی کہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اس کی سند کیا ہے۔ اس کی اتھارٹی کیا ہے۔ اس کے صحیح ہونے کی دلیل کیا ہے۔ اگر آپ ان حضرات سے یہ پوچھتے تو یہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی کہ یہ الفاظ جنہیں اس طرح اٹھتے بیٹھتے دہرایا جاتا ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ۔ (۱۲/۴۰) بس چند الفاظ ہیں جنہیں یا تو یہ اپنے آباؤ اجداد سے سنتے چلے آرہے ہیں، اور یا خود وضع کر لئے ہیں۔ ان کا کوئی متعین مفہوم کسی کے ذہن میں نہیں اور جو مفہوم یہ پیش کرتے ہیں وہ ایک دوسرے سے ملتا نہیں۔ "اسلامی نظام" تو خیر بعد کی بات ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ۱۹۵۳ء کے فسادات پنجاب کی تحقیقاتی کمیٹی نے (جسے عرفِ عام میں منیر کمیٹی کہا جاتا تھا) ملک بھر کے چیدہ چیدہ حضرات علماء کرام سے یہ پوچھا تھا کہ "مسلمان کسے کہتے ہیں؟" اور اس سوال کے جو جوابات ان کی خدمت سے دیئے گئے تھے، ان میں سے کسی ایک کا جواب دوسرے سے نہیں ملتا تھا۔ ان جوابات کا تجزیہ کرنے کے بعد ارکانِ کمیٹی نے لکھا تھا کہ:-

مسلمان کسے کہتے ہیں؟

مفہوم متعین نہیں

اس سوال کے جواب میں جو کچھ کہا گیا ہے اس پر اس سے زیادہ کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں کہ ان میں سے کسی دو علماء کا جواب بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتا۔ اگر ہم اس سوال کا جواب اپنی طرف سے دے دیں اور وہ جواب حضرات علماء کرام کی طرف سے دیئے گئے جوابات کے خلاف ہو تو ہمیں فوراً دائرہ اسلام سے خارج کر دیا جائے اور اگر ہم ان حضرات میں سے کسی ایک کے جواب کو صحیح تسلیم کر لیں تو ہم اس کے نزدیک تو مسلمان ضرور قرار پا جائیں لیکن اس کے علاوہ باقی حضرات کے جوابات کی رُو سے کافر گردانے جائیں۔ (ص ۲۱)

آپ سوچئے کہ جب ہم متفق طور پر اتنا بھی نہیں بتا سکتے کہ "مسلمان کسے کہتے ہیں" تو یہ کون متعین کریگا کہ "اسلامی نظام" کیا ہے اور اس کی سند کیا ہوگی کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ فی الواقعہ اسلامی نظام ہے۔ سوچئے کہ یہ بات بڑی گہری سوچ کی متقاضی ہے۔

نظریۂ پاکستان

اب ایک قدم آگے بڑھیئے۔ پہلے تو بات "اسلامی نظام" تک محدود تھی، اب ہمارے سیاسی لغت میں ایک اور اصطلاح کا بھی اضافہ ہوا ہے اور وہ اصطلاح "نظریۂ پاکستان" ملک کی ہر جماعت اور ہر پارٹی نظریۂ پاکستان کی مدعی ہے اور اس کا تحفظ اپنی سیاسی جدوجہد کا مقصود بتاتی ہے۔ یہ اصطلاح بھی آجکل اس شد و مد سے دہرائی جاتی ہے کہ باید و شاید۔ لیکن جو پریشانی فکر و نظر اسلامی نظام کے مفہوم کے سلسلہ میں سامنے آتی ہے اس سے کہیں زیادہ تشتتِ قلب و نگاہ "نظریۂ پاکستان" کے ضمن میں سامنے آرہا ہے۔ ہر ایک اس کا مدعی بھی ہے اور ہر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار بھی۔ یہ اسے جھوٹا کہہ رہا ہے وہ اسے۔ یہ اسے گالیاں دے رہا ہے وہ اسے۔ حتیٰ کہ اب طعن و تشنیع، طنز و استہزاء، گالی گلوچ سے معاملہ آگے بڑھ کر نوبت سر پھٹول تک آپہنچی ہے۔ اور اگلا قدم ملک میں گوریلا جنگ اور ان کے مقابلہ کے لئے رضاکارانہ تنظیموں کا بتایا جا رہا ہے اور یہ سب "اسلامی نظام کے قیام اور نظریۂ پاکستان کے تحفظ کے دعوے داروں کیطرف سے

ایک وہ تھے

ہو رہا ہے۔ اسلامی نظام کے قیام کے ایک دعوے دار وہ تھے جن کی خصوصیات یہ بتائی گئی تھیں کہ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ۔ (۴۸/۲۹) وہ مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت تھے لیکن باہم گرا بریشم کی طرح نرم۔ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۔ (۵/۵۴)۔ آپس میں ایک دوسرے کے سامنے جھک جانے والے لیکن دشمن کے سامنے اکڑ کر کھڑے ہونے والے۔ یہ وہ تھے جن کے متعلق خدائے کائنات نے یہ کہا تھا کہ۔ فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا (۳/۱۰۳) خدا نے ان کے دل ایک دوسرے سے جوڑ دیئے تھے۔ اور وہ

نوازش ایزدی سے ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے تھے۔ ان کی باہمی دردمندیوں اور غمگساریوں کا عالم یہ تھا کہ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔ (۵۹/۹) وہ خود تنگی ترشی میں گزارہ کر لیتے تھے لیکن دوسرے بھائی کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتے تھے — اسلامی نظام کے قیام و

ایک ہم ہیں

استحکام کے ایک دعویدار وہ تھے اور ایک دعوے دار یہ ہیں کہ ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہیں بایں نمط کہ — آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں خنجر کھلا — یہ سب اس لئے کہ وہ حضرات (رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ) جانتے تھے کہ اسلامی نظام کا مفہوم کیا ہے۔ اور مومن کا نظریہ زندگی کیا۔ ان سب کے نزدیک ان الفاظ کا مفہوم ایک تھا، مطلوب ایک تھا۔ اور اسی لئے ان میں نہ باہمی اختلاف تھا نہ افتراق۔ نہ تشتت تھا نہ انتشار۔ وہ توحید کا حقیقی مقصود جانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ توحید، توحید نہیں جس کے ماننے کے بعد آپس میں اختلاف و افتراق رہے۔ توحید کا عملی نتیجہ وحدتِ ملت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے تفرقہ کو شرک قرار دیا ہے جب کہا ہے کہ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا۔ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ۔ (۳۰/۳۱)۔

تفرقہ شرک ہے

مسلمانو! دیکھنا۔ تم کہیں مومن ہونے کے بعد پھر سے مشرک نہ ہو جانا۔ یعنی ان میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈال دیا اور (امتِ واحدہ رہنے کے بجائے) اپنی ایک الگ پارٹی بنالی۔ پارٹی بازی میں ہوتا یہ ہے کہ ہر پارٹی مگن ہوتی ہے کہ میں حق پر ہوں۔ اور باقی سب باطل پر ہیں۔ آپ نے غور کیا کہ قرآنِ کریم نے، قوم میں تفرقہ کو شرک قرار دیا ہے اور نبی اکرمؐ سے واضح الفاظ میں فرما دیا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ۔ (۶/۱۶۰) جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر لیں اور فرقے اور پارٹیاں بنا کر بیٹھ جائیں، اے رسول! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں! دین میں تفرقہ پیدا اُس وقت ہوتا ہے جب اُس کے اساسات کا مفہوم متعین نہ رہے اور مفہوم کے غیر متعین ہونے کا فطری نتیجہ باہمی اختلاف و افتراق ہے۔ نصب العین کی وحدت بھی اسی وقت تک رہتی ہے جب تک اس کا مفہوم متعین اور متفق علیہ ہو۔ یا یوں کہئے کہ جن کے سامنے اپنی جدوجہد کا مفہوم متعین ہو ان کا نصب العین بھی ایک ہوتا ہے۔ اسی (وحدتِ نصب العین) سے ملت کی تشکیل ہوتی ہے اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

چیست ملت ؟ ایکہ گوئی لا الٰہ
با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ

عہدِ اول کے مسلمانوں کی یک نگہی اور ہم آہنگی کا تو پوچھنا ہی کیا، تعین مقصد و مفہوم سے کس قسم کی

وحدتِ فکر و عمل پیدا ہوتی ہے اس کا نظارہ ہم تحریکِ پاکستان کے زمانے میں کر چکے ہیں۔ جب قوم نے اپنا

تحریکِ پاکستان کے دوران

نصب العین متعین کر لیا اور اس کے مفہوم میں کسی قسم کا ابہام نہ رہا، تو پھر ان لوگوں میں جنہوں نے حصولِ پاکستان کو اپنا نصب العین قرار دے لیا تھا، کسی قسم کا باہمی اختلاف نہ تھا، افتراق نہ تھا۔ اس وقت اختلاف تھا تو ان لوگوں سے جنہوں نے اس منتہیٰ کو اپنا مقصود قرار نہیں دیا تھا اور وہ اعلانیہ اس کا اعتراف کرتے تھے، اقرار کرتے تھے۔ لیکن آج ہماری حالت یہ ہے کہ ہر ایک کا دعویٰ ایک ہی ہے — یعنی اسلامی نظام کا قیام اور نظریۂ پاکستان کا استحکام — اور اس دعویٰ کے مدعی، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں! یاللعجب۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان الفاظ کا متفق علیہ مفہوم متعین نہیں کیا گیا۔

(٠)

اسلامی نظام اور نظریۂ پاکستان کی اصطلاحات ہی کچھ کم وجۂ افتراق و باعثِ نزاع نہ تھیں کہ ان میں

معاشی نظام

ایک اور کا اضافہ ہو گیا اور یوں سمندِ نازیہ اک اور تازیانہ ہوا۔ یعنی اسلام کا معاشی نظام — ایک طرف سے آواز آتی ہے کہ اسلام کا اپنا مخصوص معاشی نظام ہے جو ہماری تمام مشکلات کے حل کا ضامن ہے۔ لیکن ایسا دعویٰ کرنے والوں نے آج تک یہ نہیں بتایا کہ متعین طور پر وہ نظام کیا ہے اور قائم کس طرح سے ہوگا۔ دوسری طرف سے کہا جاتا ہے کہ ہمارا صحیح معاشی نظام اسلامک سوشلزم ہے۔ یہ اصطلاح دو الفاظ سے مرکب ہے۔ اسلام اور سوشلزم۔ اسلام کے متعلق ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ اس کا کوئی متعین مفہوم ہمارے سامنے نہیں۔ باقی رہی سوشلزم، سو اس کا مفہوم ہر ملک میں الگ ہے، ہر مملکت میں جداگانہ ہے۔ اور جب ان (ہر دو) اجزا کی یہ کیفیت ہے کہ ان کا مفہوم متعین نہیں تو ظاہر ہے کہ ایسے اجزا سے جو مرکب وجود میں آئے گا اس کا مفہوم کیا ہوگا؟ ان حضرات میں سے بھی کسی نے آج تک نہیں بتایا کہ سوشلزم سے کیا مراد ہے، اسلامک سوشلزم کیا ہے اور وہ (UN-ISLAMIC SOCIALISM) سے کس طرح مختلف اور متبائن ہے۔ نتیجہ یہ کہ اس کے مدعی اسے عین مطابقِ اسلام قرار دیتے ہیں اور مخالفین ایسا کہنے والوں پر کفر کا فتوےٰ لگا رہے ہیں۔ اور دلچسپی یہ کہ ان کفر کا فتویٰ لگانے والوں میں سے ہر ایک پر خود کفر کا فتوےٰ لگ چکا ہوا ہے۔ یاد رکھئے! مسلمانوں میں کوئی بھی فرقہ ایسا نہیں جس پر دوسرے فرقہ والوں نے کفر کا فتویٰ نہ لگایا ہو۔ اور جو حضرات کفر کا فتوےٰ صادر کرتے ہیں وہ بہرحال کسی نہ کسی فرقہ سے متعلق ہوتے ہیں۔

یہ ہے عزیزانِ من! وہ دیوارِ بابل جس کے سایہ میں بیٹھی قوم، اس زبان میں گفتگو کر رہی ہے جس

کا ایک لفظ کسی دوسرے کی سمجھ میں نہیں آتا اور جس کی وجہ سے سب ایک دوسرے سے لڑجھگڑ رہے ہیں۔ افرادِ قوم کی یہ حالت ہے اور راہ نمایانِ قوم کے سامنے ایک ہی مقصد ہے اور وہ یہ کہ قوم کے جذبات کو اس طرح پیہم اور مسلسل مشتعل کئے چلے جائیں کہ ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی نہ رہے — اور اقبالؒ کے یہ الفاظ تو آپ سن ہی چکے ہیں کہ قومیں اس وقت تباہ ہوتی ہیں جب ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت نہ رہے۔

---(۰)---

مجھے اس کا احساس ہے کہ آپ کے دل میں یہ خیال ابھرے گا کہ

کچھ ہوش میں آنے کی ہے کچھ شکل بھی ناصح
یہ میں بھی سمجھتا ہوں مجھے ہوش نہیں ہے

اس کے جواب میں میں یہ کہوں گا کہ اگر آپ نے واقعی سمجھ لیا ہے کہ ہم ہوش میں نہیں ہیں تو پھر ہوش میں آنا چنداں دشوار نہیں رہے گا۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے ہماری بیہوشی یا مدہوشی کی یہ بیماری کوئی نئی بیماری نہیں، بہت پرانی بیماری ہے اور اس کا علاج بھی کوئی نیا نہیں۔ وہی پرانا آزمایا ہوا علاج ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

اس میں شک نہیں کہ حالات بظاہر بڑے مایوس کن ہیں جن کے سدھرنے کی کوئی صورت بادی النظر میں دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن یاس و نا امیدی کی یہ کیفیت صرف اس وقت تک ہے جب تک ہم سوچنا نہیں شروع کرتے۔ جونہی ہم نے سوچنا شروع کر دیا، یاس و نا امیدی کے بادل خود بخود چھٹتے چلے جائیں گے اور امیدوں کی تابندہ شعاعیں ہمارے سینوں کو منور کرنے لگ جائیں گی۔ ہم میں اس وقت اس قدر باہمی اختلافات ہیں کہ ان کے پیشِ نظر ہم میں کوئی قدرِ مشترک دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن اس قدر اختلاف و افتراق کے باوجود ہم میں ایک قدرِ مشترک موجود ہے اگر ہم اس کی طرف آجائیں تو وہ ہماری اصطلاحات کے معانی و مفہوم بھی متعین کر دے گی اور غلط اور صحیح کے پیمانے کی کسوٹی بھی بن جائے گی۔ وہ قدرِ مشترک ہے خدائے تدبیر و جلیل کی کتابِ عظیم۔ قرآن مجید ——

قرآن بطور قدرِ مشترک

مسلمان آپس میں ہزار ہا اختلافات رکھیں لیکن ان کے مسلمان ہونے اور رہنے کی شرط یہ ہے کہ وہ خدا کی اس کتاب کو اپنا ضابطۂ حیات تسلیم کریں اور اس کے سند و حجت ہونے پر ایمان رکھیں۔ اس وقت بھی ہر مسلمان ایسا تسلیم کرتا ہے لیکن وہ صرف زبان سے ایسا کہتا ہے۔ اپنی عملی زندگی میں اُسے ایسا تسلیم نہیں کرتا۔ اگر ہم

ہر پارٹی سے اس کا مطالبہ کریں کہ اسے اپنے ہر فیصلہ اور ہر اقدام کے لئے قرآن کریم کی سند پیش کرنی ہوگی، اور اسی کا ساتھ دیں جو اس مطالبہ کو منظور کرے، تو آپ دیکھیں گے کہ ان کے ہر دعوے کا مفہوم کس طرح متعین ہو جاتا ہے اور باہمی اختلافات کس طرح مٹ جاتے ہیں۔ اسلئے کہ قرآنِ کریم نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اس کا ارشاد ہے۔ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۔ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا ۔ (۴/۸۲)۔ کیا لوگ قرآن پر غور و تدبر نہیں کرتے۔ اگر یہ خدا کے علاوہ کسی اور کیطرف سے ہوتا تو اس میں بہت سے اختلافات پائے جاتے۔ اس کے جواب میں جھٹ سے کہہ دیا جاتا ہے کہ صاحب! سیاسی لیڈروں کو چھوڑیئے، مذہبی راہ نما تو قرآن ہی کو دلیل مانتے ہیں پھر ان میں اختلافات کیوں ہیں۔ اس سوال کا تفصیلی جواب تو طویل ہے اور کافی وقت کا متقاضی لیکن میں مختصراً یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے کہ قرآن کو سند و حجت تسلیم کر لینے کے بعد بھی، باہمی اختلافات نہیں مٹ سکتے۔ تو آپ سوچئے کہ پھر قرآن کے اس دعویٰ کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں! اس سے تو معاذ اللہ آپ اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ قرآن منجانب اللہ نہیں ہے! کیا ایسا تسلیم کرنے کے بعد کوئی شخص مسلمان کہلا سکتا ہے۔ اگر قرآن کا یہ دعویٰ سچا ہے (اور اس کے سچا ہونے میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے) کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں! تو اس کا عملی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ جب ہم اپنے اختلافی امور میں اسے سند و حجت بنالیں اور غلط اور صحیح کا معیار اسے قرار دے لیں تو پھر ہم میں کوئی اختلاف باقی نہ رہے۔ اور اگر اس کے باوجود آپ یہ کہنے پر مصر ہیں کہ یہ اختلافات کسی صورت میں مٹ نہیں سکتے تو پھر معاف فرمائیے، آپ اسلامی نظام اور اسلامی قوانین کا ورد ختم کریں۔ نظام اور ضابطہ قوانین تو مملکت کے لئے ایک ہی ہوگا۔ اور اگر اس قسم کا نظام اور ضابطہ قوانین مرتب ہی نہیں ہو سکتا جس پر سب کا اتفاق ہو، تو اس تمام چیخ و پکار سے حاصل کیا ہے؟ اس وقت آپ کو شکایت ہے کہ ملک میں علیحدگی پسندی کے رجحانات پیدا ہو رہے ہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر علیحدگی پسندی کے یہ رجحانات ختم ہو جائیں اور مملکت کی سالمیت برقرار رہے، لیکن آپ نہ کوئی ایسا آئین مرتب کر سکیں جو عدل کے نزدیک اسلامی کہلا سکے اور نہ ہی ایسا ضابطہ قوانین مدون کر سکیں، تو اس وقت ملک کا جو نقشہ ہوگا اسے تصور میں لایا جا سکتا ہے!

تعبیرات میں اختلاف

اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ قرآن میں کوئی اختلاف نہیں لیکن اس کی تعبیرات (INTERPRETATION) میں اختلافات ہیں یہ نہیں مٹ سکتے۔ اس غلط اندیشی کے ازالہ کے لئے بھی تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے جس کے لئے قلتِ وقت

مانع ہے۔ اس وقت میں صرف اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ اسلامی نظام کی بنیادی شرط یہ ہوتی ہے کہ ایک ایسی اتھارٹی مقرر کر لی جائے جس کی قرآنی تعبیر ہر ایک کے لئے واجب التسلیم ہو۔ جب آپ اپنے آئین میں اس قسم کی شق رکھتے ہیں کہ آئین اور قانون کے معاملہ میں فلاں اتھارٹی کی تعبیر حرفِ آخر سمجھی جائے گی تو اس قسم کی شق قرآنی تعبیرات کو بھی محیط ہو گی۔ بالخصوص جب اسلامی نظام میں قانون کی بنیاد ہی قرآن کریم ہو گا۔ اسلامی نظام میں اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY) حاصل ہی کتاب اللہ کو ہے کہ یہی کافر و مومن میں حدِ فاصل ہے۔ خدا کا واضح ارشاد ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ - (۵/۴۴)

جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، وہی تو کافر ہیں۔

قرآن کا مقام

خدا کی حاکمیت یا اقتدارِ اعلیٰ کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس کی کتاب کو زندگی کے ہر معاملہ میں حکم تسلیم کیا جائے۔ رسول اللہؐ کی زبان مبارک سے کہلوایا گیا کہ

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا - (۶/۱۱۴)

کیا میں خدا کے علاوہ کسی اور کو اپنا حاکم بناؤں حالانکہ اس نے تمہاری طرف مفصل کتاب نازل کی ہے۔

اور اسی کے مطابق رسول اللہؐ سے ارشاد ہوا کہ

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ - (۵/۴۸)

تو ان میں کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کر۔ اور اب جبکہ تمہارے پاس حق آ گیا ہے، لوگوں کے خیالات کا اتباع مت کر۔

یہی وہ حقیقتِ کبریٰ تھی جس کے اظہار کے لئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

حتےٰ کہ

دیں ازو، حکمت ازو، آئین ازو
زور ازو، قوت ازو، تمکین ازو

اور اسلامی نظام کی یہی وہ اساس و بنیاد ہے جس کے متعلق قائداعظمؒ نے ۱۹۴۸ء میں فرمایا تھا۔ اور غور کیجئے کہ کیسے واشگاف الفاظ میں فرمایا تھا کہ

> اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن کے احکام و اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے لامحالہ آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

برادرانِ عزیز! میرے نزدیک یہی اسلامی نظام کی اساس و بنیاد ہے۔ اسی کا نام نظریہ پاکستان ہے۔ یہی اس اجمال کی تفصیل ہے کہ

پاکستان کا مطلب کیا — لا الٰہ الا اللہ

اگر پاکستان کے اربابِ مذہب و ارکانِ سیاست قائداعظمؒ کے پیش کردہ اسلامی نظام کے تصور کو اپنا نصب العین قرار دے لیں تو نہ صرف یہ کہ ان کے باہمی اختلافات ختم ہو جائیں بلکہ جس مقصد کے لئے پاکستان کا خطۂ زمین حاصل کیا گیا تھا، وہ شادابیوں اور سرفرازیوں کی ہزار جنتیں اپنے جلو میں لئے جلوہ بار ہو جائے اور یوں "زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اُٹھے"۔ اور اگر اسی حقیقت کو آپ دوسرے الفاظ میں سمجھنا چاہیں تو یوں سمجھ لیجئے کہ

> اسلام نام ہے امتِ واحدہ کے اس نظامِ اجتماعیہ کا جس میں قرآنی احکام و قوانین کی اطاعت، اپنی منتخب کردہ اتھارٹی کی وساطت سے کی جائے۔

(۰)

معاشی مسئلہ اسلامی نظام کی اس اصلِ عظیم کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر معاشی مسئلہ کے حل میں بھی کوئی دشواری پیش نہیں آسکتی۔ اس کے لئے نہ کسی کو کفر کے فتوے صادر کرنے پڑتے ہیں اور نہ ہی ڈنڈے دکھانے۔ قرآن کی رُو سے اسلامی نظامِ مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے حدود میں بسنے والے تمام ذی حیات کو سامانِ زندگی بہم پہنچائے۔ وہ نظام جو خدا کے نام پر قائم ہوتا ہے، خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا ذریعہ بنتا ہے کہ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ (ہر) زمین

میں کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے وہ مملکت تمام باشندوں کو اس کی ضمانت دیتی ہے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ ۔ (۶/۱۵۱) ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔ اب ظاہر ہے کہ کوئی مملکت ایسی عظیم ذمہ داری کو پورا نہیں کر سکتی جب تک وسائل رزق اس کی تحویل میں نہ ہوں۔ وسائل رزق میں بنیادی حیثیت زمین کو حاصل ہے۔ جب زمین کو خدا ارض اللہ کہتا ہے (۷/۱۲۸) تو اس سے مراد یہی ہے کہ یہ کسی کی انفرادی ملکیت میں نہیں رہ سکتی۔ یہ سَوَاءً لِّلسَّائِلِيْنَ رہے گی (۴۱/۱۰) یعنی تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلی۔ کیونکہ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۔ (۷/۱۰) اس میں تم سب کے لئے سامانِ معیشت ہے۔

اصل سوال

لیکن معاشی مسئلہ میں سوال اتنا ہی نہیں کہ وسائل پیداوار کو انفرادی ملکیت میں رکھنے کے بجائے اجتماعی تحویل میں دے دیا جائے۔ اصل سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کی تحویل میں انہیں دیا جائے، یا جو لوگ ان کا بندوبست کریں، وہ کس قسم کے ہیں۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں قرآن کے معاشی نظام اور دیگر نظامہائے معیشت میں فرق سامنے آتا ہے۔

آج جس غیر مسلم کو مسلمان کیا جاتا ہے اس سے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا رسمی سا اقرار لیا جاتا ہے (اور مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونے والوں کے لئے اس رسمی اقرار کی بھی ضرورت نہیں پڑتی) لیکن قرآن کی رُو سے جو شخص امتِ مسلمہ کا رکن بننا چاہے، اسے ایک معاہدہ پر دستخط کرنے پڑتے ہیں۔ اور وہ معاہدہ یہ ہے کہ:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ
بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۔ (۹/۱۱۱)

یعنی معاہدہ کرنے والا اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ بیچ دیتا ہے اور خدا اسے اس کے عوض جنت عطا کر دیتا ہے۔ یہ معاہدہ محض اعتقادی اور نظری نہیں کہ زبان سے اس کا اقرار کر لیا اور بس۔ اس معاہدہ کے بعد شخص عملاً اپنی جان اور مال کا مالک نہیں رہتا۔ (جان کا سوال اس وقت زیرِ بحث نہیں) جہاں تک مال کا تعلق ہے، وہ جان مار کر محنت کرتا ہے اور اس محنت کے ماحصل کو اپنی ملکیت نہیں سمجھتا۔ وہ اس میں سے کس قدر اپنے لئے لے سکتا ہے، اس سلسلہ میں فرمایا کہ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۔ قُلِ الْعَفْوَ ۔ (۲/۲۱۹) اے رسولؐ! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم اس میں سے کس قدر اپنے لئے رکھ لیں اور کتنا دوسروں کی ضروریات کے لئے دے دیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زائد ہے، سب کا سب۔ "ضروریات" سے مراد ہے وہ کچھ جس سے انسان ان فرائض کو سرانجام دینے کے قابل ہو سکے جو اس کے سپرد کئے گئے ہیں۔ سوال

یہ ہے کہ ایک شخص کے لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ جان مار کر محنت کرے اور اس میں سے صرف بقدر اپنی ضرورت کے رکھ کر باقی سب بطیب خاطر دوسروں کے لئے دے دے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز نہ تو کسی قسم کے میکانکی نظامِ معیشت سے کرائی جا سکتی ہے نہ محض قانون کی رُو سے یا ڈنڈے کے زور سے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان کے اندر

داخلی تبدیلی

ایک ایسی تبدیلی پیدا ہو جائے جس سے یہ جذبہ اس کا داخلی تقاضا بن جائے۔ اُسی قسم کا داخلی تقاضا جس قسم کا تقاضا (مثلاً) پیاس کے وقت پانی پینے کا ہوتا ہے۔ اور اس قسم کی داخلی تبدیلی ایمان کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ ایمان کس بات پر؟ قرآن کے عطا کردہ فلسفۂ حیات پر۔ اس فلسفۂ حیات کا ملخص یہ ہے کہ

(۱) انسانی زندگی اس کے جسم کی طبعی مشینری کا نام نہیں جسم کے علاوہ اس میں ایک اور شے بھی ہے جسے اس کی ذات یا نفس (HUMAN PERSONLITY) کہتے ہیں۔

(۲) انسان کو اس کی ذات غیر نشوونما یافتہ شکل میں ملتی ہے۔ اور زندگی کی موجودہ سطح پر اس کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کی نشوونما کرے۔

(۳) جس شخص کی ذات کی مناسب نشوونما ہو جاتی ہے وہ مرنے کے بعد زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

(۴) انسانی ذات کی نشوونما ان مستقل اقدار کی پابندی سے ہوتی ہے جو وحی کے ذریعے ملتی ہیں اور جو اب اپنی مکمل شکل میں قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔

(۵) ان میں سے ایک مستقل قدر یہ ہے کہ جس قدر کوئی شخص دوسروں کی پرورش کے لئے دے گا اسی قدر اس کی اپنی ذات کی نشوونما ہوتی جائے گی۔

یہ ہے وہ ایمان جو انسان کے اندر اس کی تڑپ پیدا کر دیتا ہے کہ جان مار کر محنت کرے اور اپنی محنت کے ماحصل میں سے اپنی ضروریات کے بقدر رکھ کر باقی سب دوسروں کی پرورش کے لئے دے دے تاکہ اس سے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی جائے۔ یہی وہ افراد جن کے ہاتھوں قرآن کا معاشی نظام قیام پذیر ہوتا ہے۔ اس نظام کی کامیابی کا راز ان افراد امت کی اس داخلی تبدیلی میں مضمر ہے جو ان کے ایمان کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ اور جب انسان کے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے تو خارجی کائنات میں اس قسم کا انقلاب رونما ہو جاتا جو نوعِ انسان کے لئے اس دنیا میں جنتی معاشرہ کا ضامن بنتا ہے۔ قرآن اسی قسم کی داخلی تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

اس میں شبہ نہیں کہ مارکس اور لینن نے جس اشتراکی نظام کا تصور پیش کیا تھا اس کے اکثر و بیشتر اجزاء قرآنی

اشتراکیت اور قرآن

نظام معیشت کے مماثل ہیں۔ لیکن اس مماثلت کے معنی یہ نہیں کہ اشتراکی نظام، قرآن کے مطابق ہے۔ قرآن کے معاشی نظام کی عمارت اس کے اپنے فلسفۂ حیات کی بنیادوں پر استوار ہو سکتی ہے۔ جو فلسفۂ حیات مارکس اور لینن نے پیش کیا تھا اور جس کے حامل آج روس یا چین ہیں، وہ فلسفۂ حیات قرآن کے نظریۂ زندگی کی یکسر ضد ہے۔ اس لئے نہ صرف یہ کہ اُن کے فلسفۂ حیات کی بنیادوں پر استوار معاشی نظام، کبھی اسلامی نظام نہیں کہلا سکتا بلکہ ان کی کمزور بنیاد اس نظام کی عظیم عمارت کا بوجھ اُٹھا ہی نہیں سکتی۔ جو فلسفۂ حیات نہ خدا کا قائل ہو نہ وحی کی رُو سے عطا شدہ مستقل اقدار کا، نہ انسانی ذات کو تسلیم کرتا ہو نہ حیاتِ آخرت کو، وہ فلسفۂ حیات اس قسم کا جذبۂ محرکہ پیدا ہی نہیں کر سکتا کہ انسان جان مار کر محنت کرے اور پھر اپنے دل کی رضامندی سے زائد از ضرورت سب کچھ دوسروں کے لئے کھلا چھوڑ دے۔ مارکسی نظام کی یہی وہ داخلی کمزوری تھی جس سے اقبالؒ نے آج سے بہت عرصہ پہلے روس کو یہ کہہ کر متنبہ کیا تھا کہ ؎

کردۂ کارِ خداونداں تمام	دل ز دستورِ کہن پرداختی
	بگذر از لا جانبِ اِلّا خرام

تو کہ طرحِ دیگرے انداختی	دل ز دستورِ کہن پرداختی
کردۂ کارِ خداونداں تمام	بگذر از لا جانبِ اِلّا خرام

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے
جستۂ اُو را اساسِ محکمے؟

یہ اساسِ محکم اُسے کہاں سے ملیگی؟ اس کے متعلق کہا کہ

داستانِ کہنہ شستی باب باب
فکر را روشن کن از اُمّ الکتاب!

اور یہی تھی وہ داخلی تبدیلی جس کی اہمیت اور ضرورت کیطرف علامہ اقبالؒ ساری عمر قوم (اور بالخصوص نوجوانانِ ملت) کی توجہ مبذول کراتے رہے۔ انہوں نے آل انڈیا مسلم کانفرنس منعقدہ مارچ ۱۹۳۲ء کے خطبہ صدارت میں (جس کا ذکر میں نے شروع میں کیا ہے) کھلے الفاظ میں کیا تھا کہ:۔

ہماری قوم کے لئے ضروری ہے کہ یہ اپنی موجودہ ذہنیت کو یکسر بدل ڈالے ..... یاد رکھو جو شخص چاہتا ہے کہ ناسازگار ماحول کو بدلے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ

> اپنی داخلی دنیا میں تبدیلی پیدا کرے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳/۱۱) ارشادِ ایزدی ہے۔ یعنی خدا کسی قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ قوم خود اپنے اندر تبدیلی نہ پیدا کرے ...... مسولینی کا نظریہ یہ تھا کہ جس کے پاس فولاد ہے اس کے پاس روٹی ہے۔ میں نے اس نظریہ میں یہ ترمیم کی ہے کہ جو شخص خود فولاد ہے اس کے پاس سب کچھ ہے .... یاد رکھو! زندگی کا شعلہ کسی سے مستعار نہیں لیا جا سکتا۔ اسے انسان کو اپنے من مندر میں خود روشن کرنا ہوگا۔

یہ ہے قرآن کا پیغام جس کی وضاحت اقبالؒ نے کی ہے۔ اس داخلی تبدیلی کے بغیر نہ اسلام کا سیاسی نظام قائم ہو سکتا ہے نہ معاشی نظام۔ لیکن اس داخلی تبدیلی کی ضرورت نہ ہمارے ہاں کے اربابِ سیاست محسوس کرتے ہیں نہ مذہبی پیشوا۔ کوئی اس نظام کو خون کی ندیاں بہا کر لانا چاہتا ہے کوئی مغربی اندازِ جمہوریت کی قانونی اور آئینی مشینری کی رُو سے۔ قلب و نگاہ کی تبدیلی نہ اِن کے پیشِ نظر ہے نہ اُن کے۔ اور ستم ظریفی کہ دونوں مدعی اسلامی نظام کے ہیں۔

ہمارے ہاں کے اشتراکی نظام کے مدعیوں کے پیشِ نظر انقلاب کا منتہیٰ یہ ہے کہ وسائلِ پیداوار اور کلیدی صنعتیں افراد کی ملکیت میں رہنے کے بجائے قوم کی ملکیت میں آجائیں۔ یعنی یہ چیزیں مملکت کی ملکیت میں دے دی جائیں۔

اندرونی تبدیلی کے بغیر قومیانا

افراد کے قلب و نگاہ میں ایمانی تبدیلی کے بغیر، وسائلِ پیداوار وغیرہ کو حکومت کی ملکیت میں دینے کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ آج ریلوے۔ روڈ ٹرانسپورٹ کا ایک حصہ۔ بجلی۔ پانی وغیرہ حکومت کی ملکیت میں ہیں۔ ان شعبوں میں جو کچھ ہو رہا ہے کیا ہم اس کا رونا بھی آئے دن نہیں روتے رہتے؟ اگر ہم نے باقیماندہ شعبے اور وسائلِ پیداوار بھی اس قوم کے حوالے کر دیئے تو کیا ہمارا یہ رونا اس سے بھی صد گنا زیادہ نہیں ہو جائے گا؟ دوسری طرف اربابِ مذہب کو دیکھئے۔ اس وقت ریلوے۔ ٹرانسپورٹ، دیگر مواصلات۔ بجلی۔ دریاؤں کا پانی۔ جنگلات۔ زمین کے اندرونی خزانے۔ معدنیات وغیرہ سب (NATIONALISED) ہیں۔ ان کے متعلق انہوں نے کبھی نہیں کہا کہ یہ حرام ہے۔ لیکن جونہی کسی نے اس فہرست میں کسی اضافہ کی تجویز پیش کی، شور مچا دیا جاتا ہے کہ اسلام خطرے میں ہے۔ غرضیکہ حالت اس وقت یہ ہے کہ

> نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری

اور خودی کی بیداری سے مقصود ہے وہ نفسیاتی تبدیلی جو قرآن کی رُو سے افراد کی داخلی دنیا میں پیدا

ہوتی ہے۔ یاد رکھیے۔ اس تبدیلی کے بغیر آپ فساد تو پیدا کر سکتے ہیں، انقلاب نہیں لا سکتے کہ انقلاب کا تو مادہ ہی تقلب ہے۔ تقلبِ نگاہ کی تبدیلی کے بغیر اسلامی انقلاب کیسے برپا ہو سکتا ہے؟

———— (۰) ————

نوجوانوں کا اضطراب

اس مقام پر ہمارا نوجوان طبقہ (جس کے جذبات کو مسلسل مشتعل کیا جا رہا ہے) تلملا اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ ملک میں غریبوں پر گوشۂ عافیت تنگ ہو رہا ہے۔ انہیں زندگی کے دن گزارنے مشکل ہو رہے ہیں۔ نہ ان کے پاس کھانے کو روٹی ہے، نہ پہننے کو کپڑا۔ نہ رہنے کو مکان ہے نہ علاج کے لئے چارہ ہے۔ غریبوں اور ناداروں کو روٹی کپڑے کی آج ضرورت ہے اور آپ ان سے کہہ رہے ہیں کہ اُس وقت تک انتظار کرو جب تک قوم میں نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا ہو جائے۔ اور نہیں سمجھتے کہ تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود۔

آہ کو چاہیئے اِک عمر اثر ہونے تک

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

مجھے اپنے ان عزیزوں کی بیتابیٔ تمنا کا پورا پورا احساس ہے۔ اور جہاں تک غریبوں کی مشکلات کا تعلق ہے، انہیں شاید معلوم نہ ہو کہ معاشی مسئلہ کو ملک میں آج ابھارا گیا ہے اور میں گزشتہ بیس سال سے مسلسل اس کے لئے پکار رہا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود میں ان نوجوانوں سے کہوں گا کہ تپِ دق کا علاج راتوں رات نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے وقت درکار ہوتا ہے اور مریض اور تیمارداروں کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس مدت کو صبر و تحمل سے گزاریں۔ اس قسم کی ایک اور مثال لیجئے ــــ ایک کسان کے ہاں من بھر گندم بیج کے لئے رکھی ہے اور اس کے بچے بھوک سے بلک رہے ہیں۔ بچوں کی بھوک کا تقاضا ہے کہ وہ اس گندم کو پسوا لے اور بچوں کو روٹی کھلا دے۔ اس سے بچوں کی دو چار دن کی بھوک کا علاج تو ہو جائے گا لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟ انکی بھوک کا مستقل علاج یہی ہے کہ بیج کو کھیت میں بو یا جائے اور فصل پکنے تک کا انتظار کیا جائے اور اس دوران میں بچوں کی روٹی کا کوئی اور انتظام سوچا جائے۔

انقلابِ نبویؐ

آپ دنیا میں سب سے عظیم آسمانی انقلاب لانے والے ــــ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم ــــ کی انقلابی جدوجہد پر غور کیجیے۔ آپؐ کی نبوت کی عمر تئیس سال کی تھی، اور چونکہ یہ دنیا میں آخری نبوت تھی اسلئے اس تئیس سالہ مدتِ نبوت کا ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری تھا۔ لیکن اس مدتِ نبوت کا آدھے سے زیادہ حصہ مکہ میں، اپنے رفقائے کار کے قلب و نگاہ میں نفسیاتی تبدیلی پیدا کرنے کی نذر ہو گیا۔ یہ عرصہ بڑا لمبا اور یہ مرحلہ بڑا صبر طلب اور ہمت آزما تھا۔ کبھی کبھی خود حضورؐ کے

دل میں بھی یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ جس مقصد کے لئے میں مسلسل مصروفِ جدوجہد ہوں کیا وہ میری زندگی میں حاصل ہو جائے گا یا میری تمام عمر انہی جاں نگاہ مشقتوں اور جگر گداز صعوبتوں میں گذر جائے گی. آپ سوچئے کہ کس قدر معصوم تھی یہ آرزو اور کس قدر فطری تھا یہ جذبہ. لیکن آپ کو معلوم ہے کہ بارگاہِ خداوندی سے اس کا جواب کیا ملا؟ یہ جواب ملا کہ اِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ ۔ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ (۱۳/۴۰) جس انقلاب کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے' ہو سکتا ہے کہ اس کا کچھ حصہ آپ کی زندگی میں آپ کے سامنے آجائے یا اس کا ظہور آپ کے بعد ہو۔ اس سے آپ کو غرض نہیں ہونی چاہیئے. آپ اپنی جدوجہد میں مصروف رہیئے اور اس کا خیال مت کیجئے کہ اس کے نتائج کب برآمد ہونگے. آپ کے ذمے یہی فریضہ ہے کہ آپ اس پیغام کو عام کرتے جائیے. یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ اس کے نتائج کب برآمد ہوتے ہیں. یہ ہمارے قانونِ مکافات کے حساب کی رُو سے ہوگا. کسان کا کام یہ ہے کہ وہ وقت پر کاشت کرے. پھر اپنی کھیتی کی مناسب دیکھ بھال کرتا جائے. فصل اپنے وقت پر پکے گی. اس کی بیتابیٔ تمنا اس وقفہ میں ذرا سی بھی تخفیف نہیں کر سکتی. جو کسان مضطرب و بیقرار ہو کر وقت سے پہلے فصل کاٹ لیتا ہے. اس کے بیلوں کو چارہ تو مل سکتا ہے' بچوں کو روٹی نہیں مل سکتی. صحیح انقلاب کے لئے عزیزانِ من! وقت درکار ہوتا ہے اور ہماری ہزار ہا تمناؤں اور آرزوں بیتابیوں اور اضطرابیوں کے باوجود فطرت اپنے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں کرتی. جس غالب نے یہ کہا تھا کہ —— کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک —— اسے اس کا بھی احساس تھا کہ —— عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب —— ہماری بیتابیٔ تمنا عشق کی صبر طلبی کے تقاضوں کا بدل نہیں بن سکتی. ہمارے یہ نوجوان روس اور

روس اور چین کی مثال

چین کی مثال پیش کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھئے! انہوں نے چند دنوں میں کتنا بڑا انقلاب برپا کر دیا۔ ان کی بھول یہ ہے کہ وہ اس انقلابی جدوجہد کی مدت کو اس دن سے شمار کرتے ہیں جب وہ محسوس طور پر دنیا کے سامنے آیا. جس زمانے میں وہ لوگ نہایت خاموشی سے اس کی تیاریوں میں مصروف رہے' وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے.

ایک جلنے کے سوا اور کوئی کیا جانے
راتیں کتنی گذر جاتی ہیں پروانے پر

اس وقت میرے سامنے پیکنگ ریویو کا ۲۰ مارچ ۱۹۷۰ء کا شمارہ ہے. دیکھئے اس باب میں انقلابِ چین کا قائد' ماؤزے تنگ کیا کہتا ہے. وہ لکھتا ہے کہ

> دانشوروں کا مسئلہ آئیڈیالوجی کا مسئلہ ہے. اور آئیڈیالوجی سے متعلق مسائل کو حل کرنے کے لئے' جبر و استبداد کے بھونڈے طریقے' نہ صرف یہ کہ مفید نہیں ہوتے بلکہ

(تحریک کے لئے) نقصان رساں ہوتے ہیں۔ ہمارے رفقاء کو معلوم ہونا چاہیئے کہ نظریاتی تبدیلی کے لئے بڑے طویل المیعاد، صبر آزما اور استقامت طلب پروگرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے (اور نہ ہی ایسی کوشش کرنی چاہیئے) کہ وہ محض چند لیکچروں اور جلسوں سے لوگوں کے ان نظریات میں تبدیلی پیدا کر دیں گے۔ قوموں کے نظریات صدیوں میں جاکر مرتب ہوتے ہیں اس لئے انہیں راتوں رات بدلا نہیں جا سکتا۔ یہ کام جبر و استبداد سے نہیں ہوگا۔ لوگوں کے قلب و دماغ کو رفتہ رفتہ اس تبدیلی کے لئے آمادہ کرنا ہوگا۔

آپ سوچیئے کہ جب اس انقلاب کے لئے جسے محض خارجی معاشرہ میں برپا کرنا مقصود ہو اس قسم کے طویل المیعاد، صبر آزما پروگرام کی ضرورت ہوتی ہے، تو اس انقلاب کے لئے، جس میں انسان کے غلط معتقدات، نظریات، تصورات، اعمال و افکار کو صحیح نظریات سے بدلنا اور انسانی سیرت و کردار کے ہر گوشے کو ایک جدید پیکر میں تبدیل کرنا مطلوب ہو، کس قدر سکون و ثبات کے ساتھ صبر آزما مراحل میں سے گذرنا ہوگا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ غریبوں اور محتاجوں کی مصیبتوں کو علیٰ حالہٖ رہنے دیں اور ان کی کوئی مدد نہ کریں۔ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ اپنا نصب العین قرآن کا معاشی نظام رکھیں جس میں ہر نوع کی سرمایہ داری کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور قوم کی دولت ابنائے قوم کی ضروریات پوری کرنے کے لئے وقف ہو جاتی ہے۔ اس نصب العین تک بتدریج پہنچا جائے گا۔ اس لئے اس کی طرف اس طرح قدم بڑھائیے کہ ملک میں فساد نہ برپا ہونے پائے اور ضرورتمندوں کی مرفہ الحالی کی شکلیں نکلتی چلی جائیں۔ اس کے ساتھ اس نفسیاتی تبدیلی کے لئے بھی عملی اقدامات کیجئے جس کے بغیر یہ نظام کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ تبدیلی کیسے پیدا ہو سکے گی، اس کے لئے میں ذرا آگے چل کر ذکر کروں گا۔

———— (۰) ————

چوروں اور ڈاکوؤں کو مارنا

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسلام کی رو سے چوروں اور ڈاکوؤں کا مارنا جائز ہے۔ ظالموں کو سزا دینا ضروری ہے، رسولِ خدا نے قریش کی جبری دستیوں، ملوکیت پسندیوں اور استحصالی قوتوں کے خلاف جنگ کی تو ہم بھی جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو کیوں نہ تہ تیغ کریں!

ان حضرات کی خدمت میں گزارش ہے کہ اسلام بے شک ظالموں اور استحصالی قوتوں کے خلاف جنگ کرنے کی اجازت دیتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ اس قسم کی اجازت دیتا کسے ہے۔ وہ اس کی اجازت حکومت کو

دیتا ہے۔ افراد کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ جسے ظالم اور غاصب سمجھیں اس کا گھر جلا دیں، اس کا سر اڑا دیں۔ اگر ہر شخص کو اس کا لائسنس دے دیا جاتے کہ وہ جسے ظالم و غاصب سمجھتا ہے اُسے تباہ اور ہلاک کر ڈے تو ملک میں ایسی انارکی پھیل جائے جس میں کسی کا کچھ بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ انفرادی طور پر ایک مسلمان کے ہاتھوں دوسرے مسلمان کا قتل کتنا بڑا سنگین جرم ہے اس کا اندازہ قرآنِ مجید کی اس آیت سے لگتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

مَنۡ يَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيۡهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيۡمًا ۔ (۴/۹۳)

جس شخص نے کسی ایک مومن کو بھی بالارادہ قتل کر دیا تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ (ہمیشہ) رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب اور لعنت ہوگی اور خدا نے اس کے لئے بہت بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

لہٰذا یہ اسلام کی تعلیم نہیں کہ کچھ لوگ اٹھ کر انہیں ختم کرنا شروع کر دیں جنہیں وہ ظالم اور غاصب سمجھتے ہیں، اور دوسرے لوگ ان کے خلاف تلواریں سونت کر میدان میں آجائیں۔ اسلام اسے حکومت کا فریضہ قرار دیتا ہے نہ کہ افراد کی اپنے طور پر ذمہ داری۔

(۰)

آجکل ایک اور نعرہ بھی سننے میں آرہا ہے کہ "پہلے روٹی بعد میں آئین" ایسا کہنے والوں کو کون سمجھائے کہ جس مملکت میں آئین نہ ہو وہاں (LAW OF JUNGLE) جنگل کا قانون کارفرما ہوتا ہے اور جنگل کا قانون یہ ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ یہ صحیح (اسلامی) آئین کی قوت ہے جس سے لاٹھی والے سے کہا جاتا ہے کہ وہ بھینس کے سینگ تھامے رکھے تاکہ اس کا دودھ وہ شخص اطمینان سے دوہ سکے جس کے بچوں کو اس دودھ کی ضرورت ہے۔ یہ آئین کی حکمرانی ہے جس میں (فاروق اعظمؓ کے الفاظ میں) کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

طاقتور کمزور تر ہوتا ہے جب تک اس سے کمزور کا حق نہ دلا دیا جاتے۔ اور کمزور طاقتور ہوتا ہے جب تک اسے اس کا حق نہ مل جائے۔

لہٰذا میں اپنے ان عزیزوں سے کہوں گا کہ وہ آئین سے پہلے روٹی کا مسئلہ حل کرنے کے بجائے اپنی کوششیں ایسا آئین مرتب کرنے میں صرف کریں جس کی رُو سے روٹی کا مسئلہ اس طرح حل ہو جائے کہ (قرآنِ کریم کی پیش کردہ مثال میں) درختوں کے پھل خود جھک کر ضرورتمندوں کی جھولی میں آگریں۔

آئین کا سوال سامنے آگیا تو توجہ کا رُخ اس چیخ و پکار کی طرف مڑ گیا جس میں دہائی دی جا رہی ہے کہ آئین مرتب کرنے کے لئے ایک سو بیس دن کی مدت ناکافی ہے۔ ان حضرات کی کیفیت ایسی ہی ہے جیسے ایک شخص نے اپنے

کمرہ کا دروازہ اندر سے بند کر رکھا تھا اور رو رہا تھا کہ میں باہر کیسے نکلوں! ابھی الیکشن میں چھ ماہ کا عرصہ باقی ہے۔ آئین سازی کے لئے چار ماہ اس کے بعد بھی مل جائیں گے۔ آپ حضرات، بجائے اس کے کہ اپنا وقت ایک دوسرے کو گالیاں دینے میں ضائع کریں، ابھی سے مل بیٹھ کر آئین کا مسودہ مرتب کرنے کی تیاریاں کیوں نہیں شروع کر دیتے۔ آئین ساز اسمبلی میں، بالآخر آپ کی پارٹیوں کے نمائندے ہی جائیں گے جس آئین کا مسودہ آپ مرتب کریں گے ان کی تصویب سے وہی آئین بن جائے گا —— لیکن اگر صورت یہی ہے کہ آپ مل کر ایک جگہ بیٹھ ہی نہیں سکتے تو پھر ایک سو بیس دن تو ایک طرف، آپ ایک سو بیس سال میں بھی آئین مرتب نہیں کر سکتے۔ آپ دوسروں کے سر الزام دھرنے کے بجائے خود اپنا احتساب کر لیں تو ساری مشکلات حل ہو جائیں۔

———— (۷) ————

میں نے عزیزانِ من! جو کچھ اس وقت تک کہا ہے، اس کا ملخص یہ ہے کہ

(۱) پاکستان کو اس لئے حاصل کیا گیا تھا کہ یہاں اسلامی نظام قائم کیا جا سکے۔

(۲) اسلامی نظام سے مقصود ہے، امتِ واحدہ کا وہ اجتماعی نظام جس میں قرآن کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت اپنی منتخب کردہ آئینی اتھارٹی کی وساطت سے کی جائے۔

(۳) جہاں تک معاشیات کا تعلق ہے، اس نظام میں، نہ وسائلِ پیداوار کسی کی ذاتی ملکیت میں رہتے ہیں اور نہ ہی فاضلہ دولت (جو نظامِ سرمایہ داری کی اصل و بنیاد ہے) کسی کے پاس رہتی ہے۔ یہ سب ملّت کے اجتماعی نظام کی تحویل میں آجاتے ہیں تاکہ ان سے تمام افراد مملکت کی جسمانی اور انسانی نشوونما کا انتظام کیا جا سکے۔

(۴) یہ نظام اس امت کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے جس کے افراد کے قلب و دماغ میں صحیح قرآنی تبدیلی واقع ہو چکی ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ ان افراد کے اندر اس قسم کی تبدیلی کس طرح پیدا ہو گی۔ اس کا طریق وہی ہے جو

یہ تبدیلی کیسے ہو؟

(قرآن کریم کی راہ نمائی میں) خود حضور نبی اکرمؐ نے اختیار فرمایا تھا —— یعنی یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ۔ یعنی کتاب اللہ کے احکام و قوانین اور حکمت و بصیرت کی تعلیم۔ یعنی تعلیم وہ ذریعہ ہے جس سے افراد کے قلب و دماغ میں صحیح تبدیلی ہو سکتی ہے۔

میں نے عزیزانِ من! تحریکِ پاکستان میں اپنی استطاعت کے مطابق، امکان بھر حصہ لیا تو اس لئے کہ میں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا کہ اسلام ایک زندہ نظامِ حیات اسی صورت میں بن سکتا ہے جب اس کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ اور حصولِ پاکستان کے بعد قرآن کریم پر غور و فکر سے یہ بات بھی میری سمجھ میں آگئی تھی کہ اس

خطۂ زمین میں اسلامی نظام اسی صورت میں متشکل ہو سکتا ہے جب نونہالانِ ملت کی تعلیم قرآنی خطوط کے مطابق ہو۔ اس تعلیم سے قوم اس قابل بن جاتی ہے کہ وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے ان کے ماحصل کو وحی کی رُو سے عطا کردہ مستقل اقدار کے مطابق، نوعِ انسانی کی منفعت کے لئے صرف کرے۔ میں نے برادرانِ عزیز! پاکستان میں مروجہ طریق و نصابِ تعلیم میں تبدیلی کی طرف قوم کی توجہ بالعموم اور ارباب حل و عقد کی بالخصوص مبذول کرائی — اور اپنی اس کوشش کو مسلسل جاری رکھا۔ لیکن مجھے انتہائی افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ حضرات اپنے اپنے مقاصد میں جذب رہے اور جس مسئلہ پر قوم اور پاکستان کے مستقبل کا انحصار تھا اس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ ہم عزیزانِ من! آج جس قوم کے ہاتھوں اس قدر نالاں ہیں، یہ قوم مریخ سے نہیں ٹپک پڑی۔ یہ وہی قوم ہے جسے ہم بیس بائیس سال

تعلیمی نظام

سے اپنی درسگاہوں — اسکولوں، کالجوں، مکتبوں، دارالعلوموں — میں تیار کرتے رہے ہیں۔ اس قوم کو بنایا ہم نے خود ہی ایسا ہے۔ اور جب یہ ایسی بن چکی ہے تو ہم اسے موردِ الزام ٹھہراتے ہیں کہ تم ایسی کیوں ہو؟ اور طرفہ تماشہ یہ کہ ہم موجودہ قوم کے ہاتھوں نالاں بھی ہیں اور اسی قسم کی قوم تیار کرنے میں مصروف بھی! یعنی ہم اپنی مروجہ تعلیم کے برگ و بار سے اس قدر ملولِ خاطر بھی ہیں اور اس کے ساتھ ہی اسے علی حالہٖ جاری بھی رکھے ہوئے ہیں۔ اس میں کسی تبدیلی کے لئے تیار نہیں۔

میں نے عزیزانِ من! چاروں طرف سے ہار تھک کر بالآخر یہی سوچا کہ اگر اس کے لئے قوم اجتماعی طور پر تیار نہیں ہوتی، تو ہم انفرادی طور پر ایک ایسی درسگاہ قائم کر دیں جو اس باب میں ماڈل کا کام دے سکے۔ اس درسگاہ میں تعلیم کا انداز کیا ہوگا؟ اس کا تصور علامہ اقبالؒ نے نہایت جاذب اور حسین پیرایہ میں اس طرح پیش کیا ہے کہ

کھلے ہیں سب کے لئے غربیوں کے میخانے
علامِ تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں!

لیکن —

اسی سرور میں پوشیدہ موت بھی ہے تری
ترے بدن میں اگر سوز لا الٰہ نہیں

اس درسگاہ میں نصابِ تعلیم تو وہی ہوگا جو یونیورسٹی تجویز کرتی ہے تاکہ یہاں کے فارغ التحصیل طلباء تعلیم کے عام میدان میں کسی سے پیچھے نہ ہوں۔ لیکن اس نصاب کو پڑھایا اس طرح جائے گا کہ طلباء میں اس بات کے پرکھنے کی تمیز پیدا ہو جائے کہ اس میں حق کیا ہے اور باطل کیا ہے۔ کونسی چیز قرآنی نظریۂ زندگی اور مستقل اقدار کے مطابق ہے اور کون سی ان کے خلاف۔ اور اس کے بعد ان میں ایسی استعداد پیدا ہو جائے کہ وہ قرآنی نظامِ حیات کو دنیا کے سامنے، علومِ حاضرہ کی روشنی میں اس طرح پیش کر سکیں کہ سننے اور سمجھنے والے علیٰ وجہ البصیرت پکار

اٹھیں کہ انسانیت کی مشکلات کا حل اس نظام کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔

میں عزیزانِ من! آجکل اسی درسگاہ کے قیام کی کوششوں میں مصروف ہوں ــــ کہ یہی ہے اتنوں کے مرض کہن کا چارہ۔ آخر میں میں اس کی وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ مجوزہ درسگاہ میں قرآنی تعلیم اسی نہج سے دی جائے گی لیکن اس کے نظم و نسق سے ادارہ طلوعِ اسلام کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ کالج، قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کے زیرِ اہتمام قائم ہوگا جو ایک آزاد، رجسٹرڈ سوسائٹی ہے۔ دعا کیجئے اللہ تعالیٰ اس اسکیم کو کامیابی سے ہمکنار کرے اور اس درسگاہ سے اس قسم کے نوجوان تعلیم و تربیت پاکر نکلیں جو قوم اور ملک کے لئے سرفرازی کا موجب، اسلام کے لئے تقویت کا باعث اور نوعِ انسانی کے لئے رحمت ثابت ہوں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ ـــــــ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

والسلام

(پرویز)

انسانی مسائل کے حل میں

عقلِ انسانی آج تک کن کن ارتقائی مراحل سے گزری اور اس نے کہاں کہاں اور کیا کیا ٹھوکریں کھائیں۔ تاریخِ انسانی کی یہ عبرت آموز تفصیل آپ کو صرف پرویز صاحب کی مشہور کتاب

انسان نے کیا سوچا

میں ملے گی!

ہزاروں کتابوں کا نچوڑ۔ افلاطونِ اعظم سے لے کر آج تک گزشتہ اڑھائی ہزار سال میں دنیا کے چوٹی کے مفکرین، مؤرخین اور علمائے اخلاقیات و عمرانیات اور ماہرینِ معاشیات و سیاسیات نے کیا سوچا۔ اسے پڑھئے اور سوچئے کہ وحی کی روشنی سے روگرداں اور محروم ہو کر نوعِ انسان نے اپنے لئے کیا جہنم خرید لیا ہے!

پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی گلبرگ لاہور

قیمت
بارہ روپے

مفہوم القرآن کا نیا ایڈیشن

پرویز صاحب کی شہرۂ آفاق تصنیف "مفہوم القرآن" کے نئے ایڈیشن کی اشاعت کا سوال زیرِ غور ہے چونکہ یہ تیس پاروں پر مشتمل سلسلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے اور ملک کے علمی طبقہ میں اس کے متعلق بڑی دلچسپی لی جا رہی ہے اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اس کی طباعت وغیرہ کے سلسلہ میں اہل الرائے حضرات کے مشوروں سے استفادہ کر لیا جائے۔ اس سلسلہ میں اس وقت تک مختلف گوشوں سے جو تجاویز موصول ہوئی ہیں ان کا ملخص (بلا تبصرہ) حسب ذیل ہے۔

(۱) مفہوم القرآن میں قرآن کریم کا متن نہ شائع کیا جائے صرف مفہوم شائع کیا جائے۔ اس سے اس کی ضخامت خاصی کم ہو جائیگی اور قیمت میں کمی ہو جائے گی۔ قرآن کریم کے نسخے ہر گھر میں موجود ہوتے ہیں۔ قارئین ..... متنِ قرآن اپنے نسخوں سے دیکھ لینگے۔

(۲) مفہوم القرآن کے ساتھ صرف متن ہی شائع نہ کیا جائے بلکہ متن کے نیچے مروجہ تراجم میں سے کوئی ایک ترجمہ بھی شائع کیا جائے۔ اس سے اس کی ضخامت تو ضرور بڑھ جائے گی لیکن افادیت میں اضافہ ہو جائیگا۔

(۳) مفہوم القرآن کو اس طرح شائع کیا جائے کہ ہر صفحہ میں ایک طرف متن قرآن ہو اور اسکے بالمقابل اس کا مفہوم۔ اس طرح پڑھنے میں آسانی رہے گی۔

(۴) اس وقت مفہوم مختصر ہے۔ اسے اور پھیلا دیا جائے تاکہ قرآنی حقائق زیادہ عام فہم ہو جائیں۔

(۵) اسے اس طرح شائع کیا جائے کہ مفہوم کا انگریزی ترجمہ بھی ساتھ ہی سامنے آ جائے۔

قارئین سے درخواست ہے کہ وہ مندرجہ بالا تجاویز کے متعلق بھی اپنے مشوروں سے مطلع فرما دیں۔ اور اگر ان کے علاوہ کوئی اور تجویز ان کے ذہن میں ہو تو اس سے بھی ہمیں مستفید فرمائیں۔ اس کے لئے ہم ان کے شکر گذار ہوں گے۔

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام
گلبرگ - لاہور

(۷×۷)

باسمہٖ تعالیٰ

ہمارا پریس

لائلپور کا اجتماع

دس اپریل کی صبح، پرویز صاحب، اپنے رفقاء کی معیت میں لائلپور پہنچے۔ بزمِ طلوعِ اسلام لائلپور نے شام کے ۷ بجے میونسپل ہال میں ایک جلسۂ عام کا اہتمام کر رکھا تھا جس سے پرویز صاحب نے خطاب کرنا تھا۔ خطاب کا عنوان تھا "پاکستان کا مطلب کیا؟" لائل پور جیسے شہر کی پُرشور فضا میں یہ اجتماع سنجیدگی و متانت اور سکون و وقار کا ایک قابلِ رشک نمونہ تھا۔ تلاوتِ قرآن کریم اور کلامِ اقبالؒ کے بعد محترم نذیر حسین عارف صاحب نے "فکرِ پرویز اور تحریکِ طلوعِ اسلام" کا تعارف نہایت بلیغ انداز سے کرایا۔ اس کے بعد پرویز صاحب کا خطاب شروع ہوا، جو قریب دو گھنٹے تک سحر انگیز انداز سے جاری رہا۔ خطاب کے دوران تحسینی الفاظ کے علاوہ کوئی سکوت شکن آواز سننے میں نہ آئی (یہ خطاب اسی اشاعت میں پیشِ خدمت قارئین ہے) خطاب کے بعد استفسارات کی دعوت دی گئی اور تھوڑی دیر میں میز پر سوالات کی پرچیوں کا ڈھیر لگ گیا۔ پرویز صاحب نے اپنے مخصوص شگفتہ اور بصیرت افروز انداز میں ان سوالات کا جواب دیا اور دس بجے کے قریب یہ حسین و سادہ و رنگین محفل برخاست ہوئی۔

اسی صبح، ۱۱ بجے، پریس کلب میں پرویز صاحب نے ایک پریس کانفرنس سے بھی خطاب فرمایا جس میں مقامی اور بیرونی اخبارات کے نمائندگان شریک تھے۔ پرویز صاحب نے پہلے اپنا پریس ریلیز خود پڑھ کر سنایا، اسکی کاپیاں تمام حضرات کو مہیا کر دی گئی تھیں، اس کے بعد پریس کے نمائندگان کی طرف سے مختلف سوالات کئے گئے جن کے نہایت اطمینان بخش جوابات پرویز صاحب نے دیئے۔ یہ محفل بھی بڑی پُرسکون اور باوقار تھی جس میں کسی کی پیشانی پر شکن تک نہ دیکھی گئی۔ چائے کے بعد یہ محفل برخاست ہوئی۔ اس کی پوری کارروائی ٹیپ ریکارڈر میں محفوظ کر لی گئی تھی۔ پرویز صاحب کے پریس ریلیز کا متن حسب ذیل ہے۔

(پریس ریلیز)

"اسلامی آئین کیسے مرتب ہو سکتا ہے؟"

جن قوموں میں نظامِ حکومت سیکولر ہوتا ہے وہ اپنے مسائل آسانی سے حل کر سکتی ہیں۔ اگر وہاں کوئی ڈکٹیٹر صاحبِ اقتدار ہے تو اس کا ہر لفظ قانون بن جاتا ہے۔ اگر جمہوری نظام ہے تو پارلیمان کے فیصلے نافذ العمل ہو جاتے ہیں۔ وہاں اگر کسی مسئلہ زیرِ بحث کے متعلق گفتگو (یا اختلافات) ہوگا تو اس کے مفید یا غیر مفید ہونے پر ہوگا اور یہی فیصلہ کا معیار ہوگا۔ لیکن جو مملکت اسلامی ہونے کی مدعی ہو' اسکی صورت اس سے یکسر مختلف ہوگی۔ وہاں کوئی بھی نظامِ حکومت ہو' آخری فیصلہ کسی فرد یا گروہ کے ہاتھ میں نہیں ہوگا۔ وہاں دیکھا یہ جائے گا کہ جو فیصلہ کیا جارہا ہے وہ اسلام کے مطابق ہے یا نہیں۔ اگر وہ اسلام کے خلاف ہے تو اس کے حق میں' پارلیمان ہی کی نہیں بلکہ ملک کی پوری آبادی کی، اکیاون فیصد آراء ہی نہیں بلکہ سو فیصد آراء پرکاہ جتنا وزن نہیں رکھیں گی۔ وہ فیصلہ ملک کا قانون نہیں بن سکے گا۔ بالفاظ دیگر اسلامی مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGN AUTHORITY) اسلام کو حاصل ہوگا۔ کسی فرد یا پارٹی کو نہیں۔ حکومت اسلامی فیصلوں کو بروئے کار لانے کا ذریعہ ہوگی۔

پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا' اس لئے یہاں نظامِ حکومت بہر صورت اسلامی ہونا چاہیئے۔ یہ قولِ فیصل ہے جس میں دو آراء کی گنجائش ہی نہیں۔ لیکن جتنی آسانی سے یہ مسئلہ (کہ یہاں کا نظامِ حکومت کس قسم کا ہونا چاہیئے) نظری طور پر حل ہو جاتا ہے' اتنی ہی مشکل اس وقت درپیش ہوتی ہے جب ہم اس نظریہ کو عمل میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وہ مشکل ہے جس کی وجہ سے اس بائیس سال کے عرصہ میں یہ طے نہیں ہو سکا کہ اسلامی نظام کہتے کسے ہیں؟ یہاں صورت یہ ہے کہ جو سوال سامنے آتا ہے' اگر ایک گروہ اُسے اسلامی قرار دیتا ہے تو دوسرا کہتا ہے کہ وہ خلافِ اسلام ہے اور ملک میں کوئی اتھارٹی ایسی نہیں جس کے متعلق متفق طور پر تسلیم کر لیا گیا ہو کہ ایسے امور میں اس کا فیصلہ قولِ فیصل ہوگا۔ اتھارٹی تو ایک طرف، کوئی معیار بھی ایسا نہیں جس پر پرکھ کر' دو اور دو چار کی طرح یہ فیصلہ لے لیا جاتے کہ فلاں معاملہ اسلام کے مطابق ہے یا خلافِ اسلام۔ یہ چیز بظاہر بڑی تعجب انگیز سی نظر آئے گی لیکن ہے یہ حقیقت۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء دونوں آئینوں میں یہ شق موجود ہے کہ ملک کا کوئی قانون "کتاب وسنت" کے خلاف نہیں ہوگا' اس لئے یہ متفق علیہ معیار ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ معیار متفق علیہ ہے' لیکن یہ محض نظری طور پر متفق علیہ ہے' عملاً کیفیت یہ ہے کہ ایک ہی مسئلہ کو ایک گروہ عین مطابق سنت قرار دیتا ہے تو دوسرا اُسے خلافِ کتاب سنت ٹھہرا دیتا ہے۔ حتیٰ کہ خود ۱۹۵۶ء کے آئین کو ایک گروہ اسلامی (یعنی مطابق کتاب سنت) ٹھہرا کر اُسے نافذ کر دینے کا مطالبہ کرتا ہے تو دوسرا گروہ اُسے خلافِ کتاب سنت قرار دے کر مسترد کر دینے پر زور دے رہا ہے۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک میں اس وقت تک نہ کوئی

آئین ایسا بن سکا ہے، جسے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیا گیا ہو اور نہ ہی کوئی ایسا قانون جسے متفقہ طور پر کتاب و سنت کے مطابق قرار دیا گیا ہو اور اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ملک میں ایسا گروہ پیدا ہو رہا ہے جو کہتا ہے کہ جب آپ یہ طے ہی نہیں کر سکتے کہ اسلامی کسے کہتے ہیں اور غیر اسلامی کسے، تو اس جھگڑے کو ختم کرو اور سیدھی طرح یہاں سیکولر نظام رائج کر دو۔ ملک کو اس قسم کی غیر متعین حالت میں ہمیشہ کے لئے تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ ان خیالات کا پیدا ہونا بڑا ہی افسوسناک ہے۔ لیکن ہمیں تسلیم کرنا چاہیئے کہ یہ خیالات پیدا کر دہ ہیں اُس صورتِ حالات کے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اس کا حل یہ نہیں کہ ہم ان لوگوں کو ہدفِ طعن و تشنیع بنانا شروع کر دیں جن کے ذہنوں میں اس قسم کے خیالات پیدا ہو رہے ہیں، اس کا حل یہ ہے کہ ان حالات کو ختم کیا جائے جس کی وجہ سے ایسے خیالات ذہنوں میں ابھر رہے ہیں اور یہ حالات اسی صورت میں ختم ہو سکتے ہیں کہ ملک میں کسی ایسی اتھارٹی کو تسلیم کر لیا جائے جو ایسے متنازعہ فیہ امور میں حکم قرار پائے اور اس کے پاس ان امور کے فیصلہ کے لئے ایسا معیار ہو جس کے سامنے ہر فرقے کے مسلمان سر تسلیم خم کریں۔ ظاہر ہے کہ اسلامی مملکت میں اس قسم کی اتھارٹی حکومت ہی کے کسی ادارہ کو حاصل ہونی چاہیئے۔ انفرادی طور پر کسی فرد، جماعت یا پارٹی کو اس قسم کی اتھارٹی نہیں دی جا سکتی۔ مثلاً جس طرح آجکل اس بات کا فیصلہ کرنے کے لئے کہ فلاں حکم مروجہ قانون کے مطابق ہے یا نہیں، اور فلاں قانون، آئین کے خلاف تو نہیں ہے، سپریم کورٹ کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ اسی قسم کی اتھارٹی اسلامی مملکت میں اس امر کا فیصلہ کرے گی کہ فلاں قانون، اسلام کے مطابق ہے یا نہیں۔ اب رہا معیار کا معاملہ تو جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، کتاب و سنت کو اس باب میں معیار قرار دیا جاتا ہے، جہاں تک کتاب (یعنی قرآن مجید) کا تعلق ہے، اس کے ایک ایک لفظ کا متفق علیہ ہونا، تمام دنیا کے مسلمانوں کے نزدیک مسلمہ حقیقت ہے۔ لہٰذا اس کے معیار ہونے میں کسی مسلمان کو کلام نہیں ہو سکتا۔ اسے خود خدا نے کفر و اسلام کا معیار قرار دیا ہے۔ جب کہا ہے کہ

"جو خدا کی نازل کردہ کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے،

وہی لوگ کافر ہیں۔" (۵ : ۴۴)

لیکن سنت کی یہ کیفیت نہیں۔ سنت ہر فرقہ کی الگ الگ ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب سنت کی کیفیت یہ ہے تو اس سے ایک ایسا آئین یا ضابطۂ قوانین کیسے مرتب ہو سکتا ہے، جو تمام فرقوں کے نزدیک مطابق سنت، لہٰذا اسلامی قرار پا سکے۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں جو آپ اس قدر سر پھٹول دیکھتے ہیں تو یہ سب "کتاب و سنت" کو معیار تسلیم کرتے ہیں۔ فلہٰذا اصل دشواری یہ ہے اور جب تک اس کا عملی حل دریافت نہیں کیا جاتا، خود ان حضرات کے معیار کے مطابق بھی ملک میں اسلامی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ یہ معیار اُس صورت میں قابلِ عمل ہو سکتا ہے کہ مختلف فرقوں کے علماء حضرات مل بیٹھ کر ایک ایسا مجموعۂ سنت مرتب کر دیں جو سب کے نزدیک متفق علیہ

ہو اور جس میں کوئی چیز قرآن مجید کے خلاف نہ ہو۔ لیکن اگر یہ حضرات ایسا نہ کر سکیں تو پھر اس کے سوا اور کونسی صورت باقی رہ سکتی ہے کہ قرآن کریم کو ۔۔۔ جو تمام فرقوں کے نزدیک قدرِ مشترک اور دین میں آخری حجت اور سند ہے، معیار قرار دے دیا جائے۔

عام طور پر کہا یہ جاتا ہے کہ قرآن کریم کا متن تو بے شک متفق علیہ ہے لیکن اس کی تشریح (INTERPRETATION) میں اختلاف ہے۔ یہ موضوع بڑا تفصیل طلب ہے، اس لئے میں اس وقت اس کی تفصیل میں گئے بغیر اتنا واضح کر دینے پر اکتفا کروں گا کہ قرآن مجید میں جو قوانین اور اصول بیان ہوئے ہیں ان کا مفہوم قرآن ہی کی رُو سے متعین کیا جائے تو ان میں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوتا اور جب ہم ان قوانین و اصول کے مفہوم کے تعین کا فریضہ ایک متفق علیہ اتھارٹی کے سپرد کر دینگے تو کسی کا شخصی اختلاف باہمی مناقشت کا موجب نہیں بن سکے گا ۔۔۔ اور پھر اس حقیقتِ کبریٰ کو بھی ذہن میں رکھیئے کہ قرآنِ کریم نے اپنے من جانب اللہ ہونے کا ثبوت یہ پیش کیا ہے کہ اس میں تم کوئی اختلاف نہیں پاؤ گے (۴ : ۸۲)

لیکن اگر اس کے باوجود اس پر اصرار کیا جائے کہ قرآنی قوانین و اصول کا بھی کوئی مفہوم متفق علیہ نہیں ہو سکتا تو پھر (معاف فرمایئے) ہمیں اس کا اعتراف کر لینا چاہیئے کہ یہاں کوئی ایسا آئین یا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی کہلا سکے۔ لہٰذا اسلامی نظام کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد سوچیئے کہ ہم اُن لوگوں کے اعتراض کا کیا جواب دے سکیں گے جو یہ کہتے ہیں کہ جب آپ اس کا متفقہ طور پر فیصلہ نہیں کر سکتے کہ اسلامی کسے کہتے ہیں اور غیر اسلامی کسے، تو پھر اس کے سوا چارہ کیا ہے کہ مملکت کا نظام سیکولر ہو ۔۔۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی سوچیئے کہ ہم ان غیر مسلموں کو کیا جواب دے سکیں گے جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے، جو زمانے کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

میں نے دس سال تک حصولِ پاکستان کی تحریک میں اپنی بساط کے مطابق حصہ لیا تو اسی لئے کہ میرے نزدیک مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت کے بغیر اسلام ایک زندہ حقیقت نہیں بن سکتا اور تشکیلِ پاکستان کے بعد مسلسل اس کوشش میں ہوں کہ یہاں وہ پوزیشن نہ پیدا ہو جائے جس سے غیروں کو یہ کہنے کا موقعہ مل جائے کہ اسلام محض ایک قصۂ پارینہ ہے اب عملی دنیا میں اس کا کوئی مقام نہیں۔ میں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ قرآن کریم پر غور و فکر میں صرف کیا ہے اور میں علیٰ وجہ البصیرت یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر خدا کی اس کتابِ عظیم کو معیار تسلیم کر لیا جائے تو نہ صرف اسلامی اور غیر اسلامی کی نزاع ختم ہو جائے گی بلکہ دنیا دیکھ لے گی کہ اس (کتاب) میں اب بھی زمانے کے ساتھ چلنے ہی کی نہیں بلکہ اس کی امامت کی صلاحیت موجود ہے۔ قرآنِ کریم میں معدودے چند قوانین ہیں اور زندگی کے دیگر معاملات کے متعلق اصولی راہ نمائی دی گئی ہے۔ یہ اصول غیر متبدل ہیں جن کی چار دیواری کے اندر رہتے

ہوئے ہر زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزئی قوانین خود مرتب کئے جا سکتے ہیں۔ اس طرح قرآن کسی مقام پر بھی انسانی راہ نمائی سے قاصر نہیں رہتا۔

اس وقت ایک جدید آئین وضع کرنے کا سوال بڑی شد و مد سے ملک کے سامنے آرہا ہے۔ الیکشن یا پارلیمان درحقیقت اسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ مختلف پارٹیوں کی طرف سے کہا یہ جا رہا ہے کہ صدرِ پاکستان نے آئین مرتب کرنے کے لئے جو ایک سو بیس دن کی مدت مقرر کی ہے وہ بہت تھوڑی ہے۔ اتنی مدت میں آئین کا مرتب ہونا ناممکن یا کم از کم مشکل ہے۔ میں لیڈر حضرات کی خدمت میں گزارش کروں گا کہ وہ بجائے اس کے کہ اپنا وقت باہمی مخالفتوں میں ضائع کریں، قرآن کریم کو بنیادی معیار قرار دے کر آئین کا مسودہ کیوں نہ مرتب کر لیں جب پارلیمان کا انتخاب ہو جائے تو وہی مسودہ اس کے سامنے آجائے اور وہ علیٰ حالہٖ یا جزوی ترمیمات کے ساتھ اس کی تصویب کر دے۔ اس آئین میں یہ بھی طے کر دیا جائے کہ وہ کون سی اتھارٹی ہوگی جو یہ فیصلہ کرے گی کہ فلاں قانون اسلام کے مطابق ہے یا نہیں ـــ اس سے وہ مشکلات حل ہو جائیں گی جن میں ہماری قوم اس وقت بُری طرح سے گھری ہوئی ہے۔

پریس ریلیز آپ نے ملاحظہ فرما لیا۔ اب دیکھئے کہ ہمارے پریس نے اسے کس انداز سے شائع کیا۔ پریس کانفرنس ۱۰ اپریل کو منعقد ہوئی تھی۔ ۱۱ اپریل کو مشرق (لاہور) کے صفحہ اول پر اس کانفرنس کی خبر ذیل کی سرخی کے ساتھ شائع ہوئی۔

پاکستان میں لادینی نظام قائم کیا جائے۔ (مسٹر غلام احمد پرویز کی تجویز)

کراچی سے شائع ہونے والے روزنامہ جنگ میں یہ خبر اس عنوان سے شائع ہوئی۔

اسلامی نظام پر اتفاق نہ ہو تو لادینی نظام رائج کر دیا جائے۔ (غلام احمد پرویز)

روزنامہ نوائے وقت (لاہور) میں البتہ یہ خبر اس صحیح عنوان کے ساتھ شائع ہوئی۔

پاکستان میں نظامِ حکومت بہر صورت اسلامی ہونا چاہیئے۔ (غلام احمد پرویز)

اس کے ساتھ اس جریدہ نے پرویز صاحب کے پریس ریلیز کا بھی اچھا خاصا حصہ شائع کر دیا۔

مشرق میں یہ خبر شائع ہوئی تو اس کے بعد اس میں بیان بازی شروع ہو گئی۔ چنانچہ اس کی ۱۴ اپریل کی اشاعت میں کسی "مولانا مقبول الرحمٰن قاسمی" کا ایک بیان ذیل کے عنوان سے شائع ہوا۔

پاکستان کو لادینی ریاست بنانے کی تجویز خطرناک اور شر انگیز ہے۔

روزنامہ مشرق سے ہم نے احتجاج کیا تو انہوں نے ازرہِ عنایت اپنی ۱۵ اپریل کی اشاعت میں پرویز صاحب کا پریس ریلیز تو شائع کر دیا لیکن پہلے جھوٹی اور فتنہ انگیز خبر شائع کرنے پر نہ کوئی معذرت کی نہ اظہارِ ندامت۔ بہر حال غنیمت ہے کہ انہوں نے پریس ریلیز شائع کر دیا۔ روزنامہ جنگ کو بھی ہم نے خط لکھا تھا لیکن اس کے ردِ عمل کے متعلق ابھی تک کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔

لیکن "اسلام کے تحفظ" کا سب سے زیادہ شدید درد، روزنامہ ندائے ملت کے دل میں اٹھا۔ اور انہوں نے اپنی ۱۵ اپریل کی اشاعت میں حسبِ ذیل افتتاحیہ شذرہ شائع فرمایا (واضح رہے کہ یہ شذرہ اس وقت شائع کیا گیا جب ۱۱ اپریل کے نوائے وقت میں پرویز صاحب کا پریس ریلیز شائع ہو چکا تھا)۔ ندائے ملت کا شذرہ ملاحظہ فرمائیے۔

"مسٹر پرویز کا نیا شوشہ"

"ابھی دو تین روز قبل پرویزیہ فرقے کے سربراہ مسٹر غلام احمد پرویز نے یہ شوشہ چھوڑا ہے کہ اگر ملک کا آئین نہیں بنایا جا سکتا تو پھر ملک کو لادینی مملکت قرار دے دیا جائے۔ انہوں نے اس ضمن میں دلیل یہ دی ہے کہ مختلف فرقوں کا متفق ہونا محال ہے۔ مسٹر پرویز کی اس "روشن خیالی" کے خلاف اسلام دوست عوامی حلقوں میں بجا طور پر شدید ردِ عمل کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اس مرحلہ پر ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ مسٹر پرویز اسلام میں ایک نئے فرقہ کے بانی ہیں اور انہوں نے انگریز کی ادنیٰ ملازمت کے دوران اپنی تحریک مسلمانوں کی خدمت کے لئے جاری کی تھی یا اسلام کے خلاف اغیار کے عزائم کی تکمیل کے لئے اور یہ کہ وہ عقلِ عیار کی بدولت کون سا لبادہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ہم انہیں صرف یہ یاد دلانا چاہتے ہیں کہ سوادِ اعظم انہیں دین کے نقب زن سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ انہوں نے (یہ جانتے ہوئے بھی کہ پاکستان اسلام کے نام پر جمہوری ذرائع سے نظامِ محمدی جاری و ساری کرنے کے لئے حاصل کیا گیا تھا اور اس جدوجہد میں لاکھوں مسلمانوں نے اپنا خون اللہ کے نام پر ہی پیش کیا تھا کسی لادینی نظام کے لئے نہیں) پاکستان کو لادینی مملکت بنانے کے لئے جس دیدہ دلیری کا مظاہرہ کیا ہے اس سے ان کے اسلام کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ انہوں نے اس "فراخدلی" کا مظاہرہ اسلام کے اٹل اور لازوال اصولوں اور دیگر شعائر میں ردّ و بدل کرنے میں بھی کیا ہے۔ عوام اس سے بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پرویز ایسے لوگ کس کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ اسلام میں یقین رکھنے والا کوئی بھی پاکستانی لادینی نظام کی بات نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی کر سکتا ہے تو اس کی مسلمانی یقیناً محلِ نظر ہے اور قوم کو ایسے مجتہدین سے خبردار رہنا چاہیئے۔ جہاں تک مسٹر پرویز کا تعلق ہے انہیں اکبر ثانی بننے کی کوشش نہیں کرنا چاہیئے انہیں علم ہوگا کہ گزشتہ چودہ سو برسوں میں اسلام میں نقب لگانے والے بہت آئے۔ وقتی طور پر انہیں شہرت بھی حاصل ہوئی لیکن بالآخر وہ قصۂ پارینہ بن گئے اور حق ہمیشہ قائم رہا۔"

آپ نے غور فرمایا کہ ہمارا پریس ملک میں کیا کر رہا ہے؟ اور یہ خبر ہے وہ لوگ ہیں جو پاکستان میں اسلامی نظام قائم کرنے کے مدعی ہیں۔ جس نظام کے کارپرداز یہ حضرات ہوں گے ان میں شریف انسانوں کا جو حشر ہوگا وہ ظاہر ہے۔

(ہم نے ندائے ملت کے ہاں بھی پریس ریلیز کی کاپی بھیجدی ہوئی ہے۔ لیکن ان سطور کی تحریر کے وقت ــ ۲۰ اپریل تک ــ ان کا کوئی ردِ عمل ہمارے سامنے نہیں آیا۔)

(جاری)

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

طلوع اسلام کی ڈاک میں ہر روز ایسے خطوط ہوتے ہیں جن میں بتایا گیا ہوتا ہے کہ اس فکر سے واقف ہونے سے پہلے وہ کس کس قسم کی گمراہیوں میں مبتلا تھے کہ وہ اسلام ہی سے برگشتہ ہو چکے تھے اور اس کے بعد اس کی پیشکش کردہ قرآنی فکر نے ان کے قلب و نگاہ میں کس قسم کی حیرت انگیز تبدیلی پیدا کر دی اور وہ دین کے کس طرح والہ و شیدائی بن چکے ہیں لیکن ہم نے ایسے خطوط کا شائع کرنا کبھی مناسب نہیں سمجھا کہ اس سے مبادا یہ سمجھ لیا جائے کہ ہم اپنی تعریف آپ کرتے ہیں۔

لیکن بعض اوقات ان میں سے ایسے خطوط بھی ہوتے ہیں جنکی اثر انگیزی ہماری اس مصلحت پر غالب آجاتی ہے۔ اور ہم ان کی اشاعت پر (یوں کہیئے کہ) مجبور سے ہو جاتے ہیں۔ اس جذبہ کے تحت کہ قوم کو معلوم ہو جائے کہ ابھی ہم میں ایسے افراد موجود ہیں جن کی قرآن سے والہانہ وابستگی ہمارے لئے موجب صد رشک ہے ہم اسی نوعیت کا ایک خط ذیل میں درج کرتے ہیں جو سندھ کے ایک دور افتادہ گوشے سے موصول ہوا ہے۔ اس میں نام اور مقام کو دانستہ حذف کر دیا گیا ہے۔ آپ اس خط کے مطالعہ کے بعد یقیناً اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ جس قوم میں اس قسم کی خواتین موجود ہوں اس قوم سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ خط بجنسہٖ شائع کیا جاتا ہے۔

(۰)

میرے پیارے بھائی جان عزیز جہان جناب غلام احمد صاحب (پرویز)

تسلیمات! سلام و رحمت۔

دیگر واضح ہو کہ رب العزت کے ہم ناچیزوں پر لاکھوں احسان ہے جو بچپن سے اپنے رب پاک سے محبت تھی اور بچپن سے پیر پرستی سے اللہ پاک جلشانہٗ نے پناہ دی۔ ہمیں اپنے والد کی یہی تعلیم تھی۔ مگر ہماری تعلیم مکمل نہ تھی۔ صرف شرک اور پیر پرستی سمجھ سکے۔ باقی سب کچھ جائز۔ مجھے مذہبی کتابیں پڑھنے کا بیحد شوق تھا۔ مگر حدیثوں کے کتاب اور ملّوں اور مولویوں کے روایتوں سے الفرقان کی عربی پڑھنے کا ثواب سمجھ کر اپنے کو مسلمان سمجھا۔ رب پاک کے شان نرالے ہیں۔ جو دل کو سکون حاصل نہ تھا اور بیقراری کی زندگی گذر رہی تھی۔ تقریباً دس سال ہوئی ہیں جو میں نے طلوع اسلام کو پڑھنا شروع

کیا۔ میرے شوہر نے اپنے دوست سے جو کراچی میں رہتا ہے ان سے چند رسالے طلوعِ اسلام کے لے آئے اور مجھے پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔ کیونکہ مجھے اردو پڑھنا نہیں آتا تھا میری تعلیم عربی فقط قرآن اور چند جماعت سندھی تھی۔ اللہ پاک کے دین ڈھونڈنے کے لئے دل تڑپتا رہا۔ مگر صحیح راہ نظر نہیں آرہی تھی۔ بچوں اور گھر گرہستی میں زندگی جانوروں کی طرح گذر رہی تھی۔ جانوروں سے بھی بدتر۔ یہاں پر میری عمر چالیس برس کو پہنچی جب میں نے اپنے شوہر ...... کے نام طلوعِ اسلام کی خریدار بنی۔ اور دلی طاقت پر پڑھنا شروع کیا۔ دل دماغ اور حافظہ ٹھیک نہیں ہے کیونکہ ایک تو بیماری دیگر تفکرات۔ میرے رب کے لاکھ شکر ہے کہ دین کا صحیح مطلب سمجھ سکی۔ صحیح دین کا راستہ صراطِ مستقیم میرے رب پاک نے مجھے دکھایا۔ ہمارا وطن ...... بہت قدیمی گاؤں ہے مگر ۲۵ برس ہوتے ہیں جو پانی کی قلت ہے اور پینے کا پانی کشتیاں بہت دور دور سے بھر بھر کے لاتے ہیں اور ہمارا وطن عزیز بہت مشکل دور سے گذر رہا ہے۔ ہمارا ملک نازک اور مفلسی کے دور سے گذر رہا ہے۔

...... میں صرف ہمارا واحد گھر ہے جو طلوعِ اسلام پڑھتا ہے اور کوئی سننے کے لئے تیار نہیں ہے اللہ پاک کے لاکھوں احسان ہے جو میرے پیارے بھائی نے ایک نیک کام (کالج) کی بنیاد رکھی ہے اور میری مالی حالت بہت سقیم ہے یہاں تک کہ پینے کا پانی پیسوں پر لے کے پیتے ہیں۔ کار (خوراک) سے بڑھ کر پیسہ پانی پر صرف ہوتا ہے۔ مگر ایسی بھلے کام میں شریک ہونے کا بہت شوق ہے۔ رسول کریم ﷺ نے جنگ کے تیاری کا حکم دیا تو اصحابؓ اکرام کے پاس جو کچھ تھا وہ لے آکر حاضر کیا۔ ایک اصحابؓ نے دو سیر چھوہارے لیکر آکر پیش کیا جو آپ نے قبول فرمایا۔ میں بھی ایک ادنیٰ سی رقم بھیج کر بہت شرمندگی سے شریک ہونا چاہتی ہوں۔ ۱۰/- روپیہ منی آرڈر کر رہی ہوں۔

میرے پیارے بھائی دین کے صحیح مفہوم تو سمجھا مگر اردو پڑھنا نہیں آتا۔ مگر میرا عزم ہے کہ مرتے دم تک طلوعِ اسلام پڑھتی رہوں گی۔ مہربان بھائی صاحب آپ دعا کریں کہ اللہ پاک جل شانہٗ نیک عملوں کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ اور میرے بچوں کو اللہ پاک ہمت اور شوق دے۔ میرے مہربان بھائی میں تمام جاہل ہوں۔ بہت دنوں سے اندھیرے میں بھٹک کر آپ کے توسط سے اور اللہ پاک کے نوازشوں سے صحیح راستے پر گامزن ہوتی ہوں۔ (آپ سے ایک استدعا ہے کہ ایک سوال کر رہی ہوں جس کا جواب طلوعِ اسلام کے ذریعے دینا تو مشکور رہوں گی۔ رمضان کے روزوں کا اور سب کچھ سمجھا ہے مگر ایک سوال ستا رہا ہے کہ عورتیں ماہوار نماز چھوڑتے ہیں جو قضا نہیں ہوتی مگر روزوں کا سمجھاؤ کہ روزہ قضا کریں یہ کیوں ہے؟[1]۔ وبجز خیر والسلام

آپکی اپنی بہن

ہم سندھی ہیں۔ اردو لکھنا نہیں آتا۔ معاف کرنا۔ والسلام!

[1] اس سوال کا جواب عزیزہ بہن کو الگ بھیجدیا گیا ہے۔

طلوعِ اسلام کالج

(بہ تسلسل فہرست مطبوعہ طلوع اسلام بابت ماہ اپریل ۷۰ء)

حسب ذیل عطیات بہ تشکر موصول ہوئے!

(فہرست "ب") :- عطیات برائے کالج فنڈ۔

۱۔ محترم محمد ارشاد صاحب بحرین بھگی۔ ۶/- روپے
۲۔ " حافظ غلام ربانی صاحب ٹیکسلا " ۵۰/-
۳۔ " شیخ محمد داؤد صاحب " " ۵۰/-
۴۔ ضلع لائلپور سے ایک مخیر دوست جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔ " ۹۵۰/-
۵۔ محترم محمد اسلم صاحب سیالکوٹ " ۱۰۰/-
۶۔ " صوبیدار عبد المجید صاحب چک ۲۳۷ ر ب (لائلپور) " ۸۸۰/-
۷۔ بزم طلوع اسلام - بج کسی۔ " ۲۰۰/-
۸۔ محترم محمد حنیف صاحب - انجینئرنگ یونیورسٹی - لاہور " ۵۰/-
۹۔ " رانا ایم طیب صاحب " " " ۲۵/-
۱۰۔ " محمد رفیق صاحب " " " ۲/-
۱۱۔ " غیاث چوہدری صاحب " " " ۱۰/-
۱۲۔ " عبد الخالق خان صاحب " " " ۲/-
۱۳۔ " احمد علی صاحب " " " ۳/-
۱۴۔ " عبد الرؤف صاحب - لاہور چھاؤنی " ۱۰۰/-
۱۵۔ " خواجہ سمیع الحق صاحب - نوشہرہ۔ " ۵۰/-
۱۶۔ " ماسٹر محمد انور صاحب - سیوکے (سیالکوٹ) " ۱۰/-
۱۷۔ " چوہدری محمد شریف صاحب نمبردار چک ۲۶۷ ر ب (لائلپور) " ۱۰۰/-
۱۸۔ حاجی بشیر احمد صاحب - ستارہ ٹیکسٹائل انڈسٹریز لائلپور " ۵۰/-
۱۹۔ محترم لطیف صاحب - گلاسگو " ۸۳/۶۵
۲۰۔ " عبد الکریم صاحب - " " ۹۶/۷۲
۲۱۔ محترم جمال الدین صاحب۔ بلفاسٹ ۹۶/۷۲ روپے
۲۲۔ " فتح علی صاحب۔ گلاسگو " ۹۶/۷۲
۲۳۔ " عبد العزیز صاحب۔ " " ۹۶/۷۲
۲۴۔ " بشیر احمد صاحب " " ۹۶/۷۲
۲۵۔ " غلام نبی صاحب بلفاسٹ " ۹۶/۷۲
۲۶۔ میسرز اے - برادرز۔ گلاسگو " ۴۶۳/۸۴
۲۷۔ محترم وحید اللہ صاحب۔ " " ۹۶/۷۲
۲۸۔ " خوشی محمد صاحب " " ۹۶/۷۲
۲۹۔ میسرز شیخ اشرف اینڈ کمپنی۔ " " ۱۹۳/۴۴
۳۰۔ محترم غلام ربانی صاحب " " ۹۶/۷۲
۳۱۔ " ایف - ایم - شریف صاحبان " " ۱۹۳/۴۴
۳۲۔ " وزیر احمد صاحب " " ۵۸/۰۴
۳۳۔ " محمد علی صاحب " " ۱۹/۳۴
۳۴۔ " این - ڈبلیو - باری صاحب " " ۳۸/۶۸
۳۵۔ " این - اے - چوہدری صاحب " " ۹۶/۷۲
۳۶۔ " محمد فیض صاحب " " ۹۶/۷۲
۳۷۔ " وزیر علی صاحب " " ۵۸/۰۲
۳۸۔ " غلام رسول صاحب " " ۹۶/۷۲
۳۹۔ " عبد الغفور صاحب " " ۳۸/۶۸
۴۰۔ " غلام رسول صاحب " " ۳۸/۶۸

نمبر	نام	رقم
۴۱	محترم اللہ بخش صاحب گلاسگو	۹۶/۷۲ روپے
۴۲	" نذیر محمد صاحب "	" ۵۸/۰۲
۴۳	" اعظم خان صاحب "	" ۳۸/۴۸
۴۴	میسرز محمد رشید اینڈ کمپنی "	" ۹۶/۷۲
۴۵	محترم امیر عطاء اللہ شاہ صاحب برمنگھم	" ۱۹/۳۴
۴۶	" ایم رشید صاحب "	" ۱۹/۳۴
۴۷	" غفور چوہدری صاحب "	" ۹/۶۷
۴۸	" ایم اسلم صاحب "	" ۱۹/۳۴
۴۹	" محمد صدیق صاحب "	" ۱۹/۳۴
۵۰	" اے رحمٰن صاحب "	" ۱۹/۳۴
۵۱	" ایم افضل کیانی صاحب "	" ۱۹/۳۴
۵۲	" افضل حسین صاحب "	" ۱۹/۳۴
۵۳	" اے عزیز صاحب "	" ۹/۶۷
۵۴	" مظاہر صاحب "	" ۱۹/۳۴
۵۵	" مولوی غلام رسول صاحب "	" ۱۹/۳۴
۵۶	محترم محمد افضل جہلمی صاحب، برمنگھم	۱۹/۳۴ روپے
۵۷	" رنگباز خان صاحب "	" ۱۹/۳۴
۵۸	" خداد خان صاحب "	" ۹/۶۷
۵۹	" چوہدری محمد زمان صاحب "	" ۲۹/۰۲
۶۰	" عبدالرحمٰن صاحب "	" ۱۹/۳۴
۶۱	" محمد قاسم صاحب "	" ۹۶/۷۱
۶۲	" چوہدری اللہ دتہ صاحب "	" ۳۸/۴۸
۶۳	" محمد جمعہ صاحب "	" ۱۹/۳۴
۶۴	" عبدالعزیز صاحب "	" ۱۹/۳۴
۶۵	" چوہدری حکم داد صاحب "	" ۱۹/۳۴
۶۶	" محمد سلیمان صاحب "	" ۱۹/۳۴
۶۷	" خواجہ گلبہار صاحب "	" ۱۹/۳۴
۶۸	" چوہدری محمد شفیع صاحب "	" ۱۹/۳۴
۶۹	ضلع نوابشاہ کے ایک مخیر دوست جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے	۱۰۰/۰۰
۷۰	محترم گوہر الرحمٰن صاحب، بھابھڑہ۔ واہ کینٹ	۱۰/۰۰

طلوعِ اسلام شمارہ اپریل ۱۹۷۰ء صفحہ ۱۰۶، نمبر شمار ۲۹، بزم طلوعِ اسلام ڈھاکہ سے موصولہ -/۵۰۰ روپے کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

نمبر	نام	رقم
۱	محترم شمس الدین صاحب۔ محمد پور۔ ڈھاکہ	-/۱۰۰ روپے
۲	" محمد احمد صاحب۔ " "	" -/۵۰
۳	" طاہر ابرار انصاری صاحب۔ "	" -/۲۵
۴	" محمد ابو داؤد صاحب۔ محمد پور "	" -/۲۵
۵	" محمد اکرم راٹھور صاحب۔ ڈھاکہ	" -/۵۰
۶	محترم حامد حسن صاحب۔ محمد پور۔ ڈھاکہ	-/۲۵ روپے
۷	" عزیز الحسن صاحب۔ " "	" -/۲۵
۸	" فضل الرحمٰن صاحب۔ "	" -/۱۰۰
۹	" طفیل محمد صاحب۔ "	" -/۱۰۰
	میزان =	-/۵۰۰ روپے

نوٹ: ۱۔ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ) بی/۲۵ گلبرگ ۲ لاہور کو دیئے گئے عطیات ایس۔ آر۔ او نمبر ۶۵/(K)/۶۵۲ مؤرخہ ۴ اگست ۱۹۶۵ء مطبوعہ گزٹ آف پاکستان پارٹ I مؤرخہ ۱۳ اگست ۱۹۶۵ء کی رو سے انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۲۲ء سیکشن ۵-۱۵ کے ماتحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے ہیں۔

(سیکرٹری) قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی۔

(ختم)

شاہد عادل

عورتوں کے اسلامی حقوق

ملک میں سیاسی سرگرمیوں کے شروع ہوتے ہی جس طرح اسلام اسلام کے نعرے بلند ہونے شروع ہوئے ہیں اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ شاید انتخابات کے بعد پاکستان خلافتِ راشدہ میں تبدیل ہو جائے گا۔ مختلف طبقات کو یقین دلایا جا رہا ہے کہ بس ووٹ ہمیں دے دیجئے۔ پھر دیکھئے ہم اسلامی نظام کے ذریعے کس طرح تمہارے زمین و آسمان دنوں میں بدلتے ہیں۔ انہی طبقات میں سے ایک طبقہ عورتوں کا ہے جس کے ووٹ شاید مردوں سے بھی کچھ زیادہ ہیں۔ اسلئے انہیں سب سے زیادہ وعدوں کے سبز باغ دکھلائے جا رہے ہیں۔

پچھلے دنوں پاکستانی عورتوں کی انجمن نے اپنے اجلاس منعقدہ کراچی میں یہ قرارداد پاس کی تھی کہ عورتیں صرف انہی سیاسی جماعتوں کو ووٹ دیں جو ملک میں نافذ شدہ عائلی قوانین کی حمایت کریں اور ان قوانین کی مخالف جماعتوں سے کسی قسم کا تعاون نہ کیا جائے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب ہماری بہنوں کی ایک کافی تعداد تعلیم یافتہ ہے اس لئے اس اپیل کا ان کے ووٹوں پر اثر انداز ہونا ایک یقینی امر تھا۔ اسلئے بعض سیاسی پارٹیوں نے تو فی الحال عائلی قوانین کے مسئلے کو گول کر دیا ہے۔ کچھ دوسری جماعتوں نے عیاری سے کام لیتے ہوئے عورتوں کو یہ یقین دلانا شروع کر دیا ہے کہ "اسلام" ان کو موجودہ نام نہاد عائلی قوانین کے مقابلے میں کہیں زیادہ حقوق عطا کرتا ہے۔ یہ اسلام ہی تو ہے جس نے قرونِ وسطیٰ میں عورتوں کو خاک سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا تھا۔ ان حضرات کی فریب دہی کا پردہ چاک کرنے کے لئے ہم بتائیں گے کہ جس "اسلام" کے یہ لوگ مدعی ہیں اور جسے یہ پاکستان میں نافذ کرنا چاہتے ہیں (اور جسے حقیقی اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں) اس "اسلام" کی رُو سے عورتوں کی حالت کیا ہوگی اور انہیں کس قسم کے حقوق حاصل ہونگے۔ آج ہم ان "حقوق" کی پہلی قسط پیش کرتے ہیں۔

نکاح میاں اور بیوی کے باہمی معاہدہ کا نام ہے اور ظاہر ہے کہ معاہدہ میں فریقین کی رضامندی ضروری ہوتی ہے۔ لیکن ان حضرات کے "اسلام" میں اس معاہدہ کو استوار کرنے کے لئے تو فریقین کی رضامندی ضروری

ہوتی ہے (اگرچہ لڑکی کی رضامندی کے لئے بھی انہوں نے عجیب و غریب طریقے وضع کر رکھے ہیں جن کی تفصیل کسی آئندہ قسط میں سامنے لائی جائے گی) لیکن اس معاہدہ کو فسخ کرنے کی صورت مختلف ہے۔ اس کے لئے شوہر کو تو اس کا ہر وقت حق حاصل ہوتا ہے کہ جب جی چاہے "طلاق، طلاق، طلاق" کہہ کر معاہدہ ختم کر دے لیکن بیوی کو کسی ظالم شوہر سے پیچھا چھڑانے کے لئے ہزار جتن کرنے پڑتے ہیں۔ اس "طلاق۔ طلاق۔ طلاق" کو ان حضرات کی اصطلاح میں 'طلاق ثلاثہ بیک مجلس' یا طلاق بدعت کہا جاتا ہے۔ اس میں ہوتا یہ ہے کہ کسی بات پر میاں صاحب کا پارہ چڑھ جاتا ہے تو وہ انتہائی تیزی میں "طلاق، طلاق، طلاق" کہہ کر نکاح فسخ کر دیتے ہیں۔ تھوڑے ہی وقت کے بعد پارہ نیچے آجاتا ہے تو اپنے کئے پر ندامت ہوتی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ نکاح پھر سے قائم ہو جائے۔ اس کے لئے 'ان حضرات نے یہ شرط لگا رکھی ہے کہ وہ مظلوم عورت 'ایک رات کیلئے کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے۔ وہ اس سے شب بسری کے بعد صبح اٹھ کر اسے طلاق دے اور اس کے بعد یہ اپنے (سابقہ) خاوند سے 'پھر سے نکاح کرے۔ اس انتہائی ذلت آمیز اور شرمناک طریق کا نام 'ان کی اصطلاح میں "حلالہ" ہے۔

طلاق بدعت اور حلالہ

چند سال قبل حکومت پاکستان نے جو عائلی قوانین نافذ کئے تھے، ان کی ایک دفعہ کی رو سے طلاق ثلاثہ بیک مجلس جو طلاق بدعت کے نام سے مشہور ہے، کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ اس طریقہ طلاق کو ختم کرنے کی وجہ وہ مفاسد تھے جو اس کے لازمی نتائج ہیں اور جن پر ہمارا سنجیدہ طبقہ مدت سے چیخ رہا تھا۔ خود علماء حضرات کو یہ تسلیم تھا کہ طلاق بدعت کا جو طریقہ رواج پا چکا ہے اس کے معصیت ہونے پر اجماع امت ہے اس لئے وہ قرآن و سنت کے خلاف ہے۔ مودودی صاحب کے الفاظ میں

> بیک وقت تین طلاق دے کر عورت کو جدا کر دینا نصوص صریحہ کی بنا پر معصیت ہے علمائے امت کے درمیان اس مسئلہ میں جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف اس امر میں ہے کہ ایسی تین طلاقیں ایک طلاق رجعی کے حکم میں ہیں یا تین طلاق مغلظہ کے حکم میں۔ لیکن اس کے بدعت اور معصیت ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ سب تسلیم کرتے ہیں کہ یہ فعل اس طریقہ کے خلاف ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے طلاق کے لئے مقرر فرمایا ہے۔
>
> (حقوق الزوجین طبع ششم صفحہ ۱۵۴، ۱۵۵)

طلاق کے اس غیر اسلامی طریقے کی وجہ سے جو مفاسد پھیل رہے تھے ان میں سرفہرست "حلالہ" تھا۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے، حلالہ کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی مرد کسی وجہ سے اپنی بیوی کو ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں

یعنی طلاق بدعت دے دے لیکن بعد میں اپنی خرمستی پر پچھتائے تو اس طلاق کے اثر کو زائل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مطلقہ عورت عارضی طور پر "ایک رات" کے لئے کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے اور وہ شخص جب ایک رات اس بیچاری سے رنگ رلیاں منائے تو پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق دوسری صبح اُسے طلاق دے دے۔ اس کے بعد پھر وہ عورت اپنے سابقہ خاوند کے لئے "حلال" ہوجائے گی۔ یعنی خرمستی کا مرتکب خاوند ہوگا اور ناک بیچاری عورت کی کاٹی جائے گی۔ اس کارروائی کے بعد کوئی شریف عورت اپنا سر اونچا کرنے کے قابل نہیں رہتی۔ بلکہ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ دوسری عورتوں کے طعنے برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے انہوں نے موت کو ترجیح دیتے ہوئے خودکشی کرلی۔ اس قسم کی بعض کارروائیوں کی جب کبھی تفصیلات سامنے آتی تھیں تو ہر شریف آدمی کا سر شرم سے جھک جاتا تھا اور ہمارے جدید قسم کے علماء اس برائی سے دین اسلام کی برأت ثابت کرنے کے لئے یوں فرمایا کرتے تھے۔

> اسی طرح اگر کوئی شخص اس نیت سے کسی عورت سے نکاح کرے کہ اس کے نکاح کے بعد طلاق دے کر وہ اس عورت کو اس کے پہلے شوہر کے لئے جائز کرنے کا حیلہ فراہم کرے تو شریعت کی اصطلاح میں یہ حلالہ ہے اور یہ بھی اسلام میں متعہ ہی کی طرح حرام ہے۔ جو شخص کسی کی مطلب براری کے لئے یہ ذلیل کام کرتا ہے وہ درحقیقت ایک فرم ساق یا بھڑوے یا جیسا کہ حدیث میں وارد ہے کرایہ کے سانڈ کا رول ادا کرتا ہے اور ایسا کرنے اور ایسا کروانے والے پر اللہ کی لعنت ہے"۔ (تفسیر تدبر القرآن۔ از امین احسن اصلاحی۔ صفحہ ۴۹۸)

مودودی صاحب اس ضمن میں فرماتے ہیں :-

> "فی الواقعہ اس طرح کے نکاح اور زنا میں کوئی فرق نہیں ہے۔ حیرت ان علماء پر ہوتی ہے جو اس صریح حرام اور نہایت شنیع اور شرمناک حیلے کا فتویٰ لوگوں کو دیتے ہیں۔

(حقوق الزوجین۔ صفحہ ۵۹-۶۰)

حضرت عمرؓ نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ حلالہ کے ارتکاب کرنے والوں کو موت کی سزا دی جائے گی۔

طلاق بدعت کا خاتمہ اور علماء کی مخالفت

یہ تھی حلالہ کی پوزیشن ان حضرات کے نزدیک۔۔ حکومت پاکستان نے اس انسانیت سوز خرابی کے ازالہ کے لئے عائلی قوانین میں طلاق ثلاثہ کے اس طریق کو ختم کر دیا۔ یہ طبقہ (نسواں) عورتوں پر بڑا احسان تھا۔ لیکن دیکھنے والوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ یہی علماء حضرات حکومت کے اس فیصلہ (یعنی عائلی قوانین) کی مخالفت کے لئے خم ٹھونک کر میدان میں آگئے۔ انہوں نے یہ نہیں فرمایا کہ طلاق ثلاثہ بیک مجلس کا اسطرح

خلافِ قرآن وسنت کے خلاف ہے۔ بلکہ اس کے لئے دلیل یہ دی کہ

> بلاشبہ یہ چیز بعض فقہی مذاہب کے نزدیک درست ہے لیکن حنفی مذہب کے خلاف ہے۔ حنفی مذہب میں اگر تین طلاق بیک وقت دیئے گئے ہوں تو اس سے طلاق مغلظہ واقع ہو جاتی ہے اور مطلقہ عورت سے اس کا سابق شوہر نہ تو مدت عدت کے اندر رجوع کر سکتا ہے اور نہ عدت گذر جانے کے بعد اس کے ساتھ پھر نکاح ہو سکتا ہے جب تک اس کی "تحلیل" نہ ہو جائے۔

(عائلی قوانین پر علماء کے اعتراضات۔ صفحہ ۱۸-۱۹)

"تحلیل" یہ وہی "حلالہ" کی پرانی شراب ہے جس کو نئے الفاظ کی بوتل میں بند کیا گیا ہے۔ خیال رہے کہ "حلالہ" (جیسا کہ عام طور پر تاثر دیا جاتا ہے) دیہاتی مولویوں کی اختراع نہیں خود حنفی فقہ میں (جس کا واسطہ دے کر خلافِ قرآن وسنت طلاق بدعت کو دوبارہ رائج کرانے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے) اس کی واضح اجازت موجود ہے۔ فقہ حنفی کی نہایت معتبر اور متداول کتاب ہدایہ اولین کے صفحہ ۳۷۷ پر جہاں حلالہ کے بارے میں یہ شرعی حکم ملتا ہے "واذا تزوجھا بشرط التحلیل فالنکاح مکروہ لقولہ علیہ السلام لعن اللہ المحلل والمحلل لہٗ۔ وھذا ھو محملہ فان طلقھا بعد وطیھا حلت للاول لوجود الدخول فی نکاح صحیح" ۔ اگر حلالہ کی شرط سے کسی عورت سے نکاح کیا تو یہ نکاح مکروہ ہے کیونکہ حضور صلعم نے حلالہ کرنے اور کرانے والوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت بھیجی ہے۔ اور اس سے مراد یہی حلالہ ہے۔ تاہم اگر اس (مکروہ نکاح) کے بعد کوئی شخص عورت سے مباشرت کے بعد اسے طلاق دے دے تو وہ پہلے طلاق دینے والے شخص کے لئے حلال ہو جائے گی۔ کیونکہ دخول نکاح صحیح میں ہوا ہے"۔

حلالہ جائز ہو گیا

دیکھئے کس طرح حلالہ جیسے حرام فعل کو فقہی حیلے کے ذریعے حلال کر دیا گیا ہے۔ اس سے بھی افسوسناک امر ان علماء کا طرزِ عمل ہے جو حلالہ کی حرمت اور برائی کے بارے میں زمین وآسمان کے قلابے ملاتے رہتے ہیں، اور جن کی تحریریں ابھی ابھی پیش کی جا چکی ہیں۔ وہی حضرات اب حلالہ کے بارے میں یوں لب کشائی فرماتے ہیں۔

> اس کے متعلق کوئی ظاہری ثبوت اس بات کا موجود نہیں ہوتا کہ نکاح کے نام سے یہ اللہ کی شریعت کے ساتھ جو مذاق کیا گیا ہے اس وجہ سے اللہ کے نزدیک تو یہ نکاح اور یہ طلاق سب باطل ہو گا۔ لیکن ایک فقیہ جو صرف ظاہر حالات کو سامنے رکھ کر فتویٰ دینے پر مجبور ہے وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس طرح کا نکاح سرے سے منعقد ہی نہیں ہو سکتا

چنانچہ اسی بنیاد پر بعض فقہا اس کے انعقاد کو مانتے ہیں اور مجھے ان کی یہ بات قوی معلوم ہوتی ہے۔

(تفسیر تدبر القرآن۔ از امین احسن اصلاحی صفحہ ۴۹۹)

ہماری بہنوں کو معلوم ہوگا کہ علماء حضرات نے علی الاعلان یہ کہا ہے کہ انتخابات کے بعد جب ان کی حکومت قائم ہوگی تو وہ سب سے پہلا کام یہ کریں گے کہ عائلی قوانین کو منسوخ کر دینگے۔ ان قوانین کو منسوخ کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مردوں کو پھر سے یہ آمرانہ اختیار حاصل ہو جائینگے کہ جب جی چاہے "طلاق۔ طلاق۔ طلاق" کہہ کر بیوی کو الگ کر دیں۔ اور اس کے بعد جب غصہ ٹھنڈا ہو تو بیوی کے لئے ضروری ہو کہ وہ پھر سے اپنے بال بچوں میں واپس آنے کے لئے ایک رات کسی دوسرے مرد کے پاس گزارے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

یہ ہے ان "حقوق" کی پہلی قسط جسے یہ حضرات "از روئے شریعت" مسلمان عورتوں کو عطا کرنے کا وعدہ فرماتے ہیں۔ ان حقوق کی باقی قسطیں بعد میں پیش کی جائیں گی۔ ہم اپنی بہنوں سے گزارش کرینگے کہ جب یہ حضرات ان سے "اسلامی حقوق" کے وعدے کریں، تو یہ ان سے کہیں کہ آپ واضح الفاظ میں بتایئے کہ

(۱) کیا آپ کی شریعت کی رُو سے، عورت کو بھی فسخ نکاح (طلاق دینے) کا اسی طرح حق حاصل ہوگا جس طرح مرد کو حاصل ہوگا۔

(۲) کیا مردوں کے لئے طلاق ثلاثہ بیک مجلس (طلاق۔ طلاق۔ طلاق) کا طریقہ جاری کیا جائے گا۔ اور

(۳) کیا اس طرح کی طلاق کے بعد، اگر میاں بیوی مصالحت کرنا چاہیں تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ عورت پہلے کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے اور اس کے ساتھ شب بسری کے بعد اس سے طلاق حاصل کرے۔

ان حضرات کے جوابات سے آپ کو خود بخود معلوم ہو جائیگا کہ جن حقوق کے یہ لوگ وعدے فرما رہے ہیں، ان کی حقیقت کیا ہے۔

(پرویز)

ذاتی ملکیت کا اصول

مروّجہ اسلام میں بڑا مقدّس سمجھا جاتا ہے،

لیکن ـــــ اسکے بارے میں قرآن کا حکم کیا ہے؟

اِسکی تفصیل نظامِ ربوبیت میں دیکھئے!

مرنے کے بعد کیا ہو گا —

ہر شخص اس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے ۔

لیکن —— اُسے جواب کہیں سے نہیں ملتا ۔

اسکا جواب ملیگا —— ایک تازہ تصنیف

جہانِ فردا

سے، جسمیں — موت ۔ قبر ۔ برزخ ۔ حشر ۔ نشر ۔ قیامت ۔ اعمالنامہ ۔ جہنم ۔ جنّت وغیرہ —— کی تفصیلات درج ہیں !

جلد حاصل کیجئے، ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑیگا

قیمت :- (اعلیٰ ایڈیشن) ۔ دس روپے ۱۰/- ۔ (جنیپ ایڈیشن) ۔ چھ روپے ۶/-

ملنے کا پتہ

ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ بی ۔ گلبرگ ۲ لاہور : مکتبۂ دین و دانش چوک اردو بازار ۔ لاہور

باب المراسلات

ختمِ نبوّت

سوال:۔ آپ نے اپنے ایک درس میں کہا تھا کہ کشف، الہام، ماموریت من اللہ، مجددیت وغیرہ کا عقیدہ، ختمِ نبوت کے منافی ہے۔ براہِ کرم اس کی مزید وضاحت فرما دیں کیونکہ یہ سوال نہایت اہم ہے۔

جواب:۔ انسان اور حیوان میں ایک بنیادی مابہ الامتیاز خصوصیت علم ہے۔ علم کسے کہتے ہیں اور اس کے حصول کا طریقہ کیا ہے؛ اسے قرآنِ کریم نے ایک آیت میں واضح کر دیا ہے جس میں کہا ہے کہ وَ لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (۱۷/۳۶) جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگ جایا کرو (یاد رکھو۔ تمہاری) سماعت، بصارت اور قلب ہر ایک سے پوچھا جائے گا: اس میں بتایا گیا ہے کہ علم وہ ہے جس کی شہادت انسان کی "سماعت، بصارت اور قلب" دیں۔ سماعت و بصارت سے مراد انسان کے حواس (SENSES) ہیں۔ اور قلب یا فواد سے مراد ہے وہ قوتِ فکر (INTELLECT) جو نتائج مستنبط کرتی ہے۔ اسے عام طور پر (MIND) کہا جاتا ہے۔ انسانی علم کے یہی ذرائع ہیں۔ آپ دور سے دھواں اٹھتا دیکھتے ہیں تو آپ فوراً کہہ دیتے ہیں کہ کہیں آگ لگی ہے۔ آپ گولی کی آواز سنتے ہیں تو سمجھ لیتے ہیں کہ کہیں بندوق چلی ہے۔ اس کے بعد چیخ کی آواز آپ کے کان میں آتی ہے تو آپ اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ گولی کسی انسان کے لگی ہے۔ اور اگر وہ آواز آپ کی جانی پہچانی ہوتی ہے تو آپ گھبرا کر کہہ دیتے ہیں کہ گولی فلاں شخص کے لگی ہے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ انسان کے حواس [سماعت (سننا) بصارت (دیکھنا)۔ ذائقہ (چکھنا)، شامہ (سونگھنا)، اور لمس (چھونا)] خارجی دنیا سے متعلق اطلاعات (INFORMATION) انسانی قلب (MIND) تک پہنچاتے ہیں اور ان اطلاعات کی بنا پر قلب ایک نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ اسے علم کہا جاتا ہے۔ یہی علم بذریعہ مدرکات (PERCEPTUAL KNOWLEDGR) ہے جس کے نتائج کی خاص ترتیب سے انسان تصورات (CONCEPTS) قائم کرتا ہے اور یوں علم کی

وسعتیں بڑھتی جاتی ہیں۔ مطالعہ۔ مشاہدہ۔ تجربہ، تفکر، تعقل، تدبر۔ یہ سب حصولِ علم کے ذرائع ہیں۔ قرآنِ کریم علم (بذریعہ حواس) کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ وہ کہیں کہتا ہے کہ وَ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـٕدَةَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۔ (۲۳/۷۸)۔ خدا وہ ہے جس نے تمہارے لئے سماعت، بصارت اور قلب پیدا کئے۔ لیکن بہت کم لوگ ہیں جو ان سے صحیح صحیح کام لیتے ہیں۔ کہیں کہتا ہے کہ قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَ اَبْصَارَكُمْ وَ خَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَیْرُ اللّٰهِ یَاْتِیْكُمْ بِهٖ (۶/۴۶) ان سے کہو کہ کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ اگر خدا تمہارے دیکھنے، سننے، سمجھنے کی قوت سلب کر لے تو اس کے سوا کون سی ہستی ہے جو ان ذرائع علم کو بحال کر دے؟ سورۃ الاعراف میں ہے کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ جہنمی کون ہیں۔ وہ جن کی کیفیت یہ ہے کہ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ بِهَا ۔ وہ دل تو رکھتے ہیں لیکن ان سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ وَ لَهُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِهَا ۔ ان کی آنکھیں بھی ہوتی ہیں، لیکن وہ ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِهَا ۔ ان کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ اُولٰٓىٕكَ كَالْاَنْعَامِ ۔ یہ لوگ دیکھنے میں انسان نظر آئیں گے لیکن درحقیقت یہ انسان نہیں حیوان ہیں۔ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ۔ بلکہ ان سے بھی گئے گذرے۔ اُولٰٓىٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۷/۱۷۹) یہ علم سے بے بہرہ رہتے ہیں؛ جو لوگ اپنے ذرائع علم سے کام نہیں لیتے، قرآن کہتا ہے کہ رفتہ رفتہ ان کی سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ ان کے دلوں پر مہریں لگ جاتی ہیں۔ ان کی آنکھوں پر پٹیاں بندھ جاتی ہیں۔ ان کے کانوں میں ڈاٹ لگ جاتے ہیں؛ (۲/۷ ; ۱۶/۱۰۸)۔ اور یہ کیفیت ان لوگوں کی ہوتی ہے جو عقل و فکر سے کام لینے کے بجائے اندھا دھند جذبات کی رو میں بہے چلے جاتے ہیں۔ (۴۵/۲۳)

قرآن کے پیش کردہ ان حقائق سے واضح ہے کہ (۱) انسان اور حیوان میں ایک بنیادی وجہِ امتیاز علم ہے۔ اور (۲) علم حاصل کرنے کا طریق یہ ہے کہ انسان، حواس کے ذریعے معلومات اخذ کرے، ان سے اپنی عقل و فکر کی رو سے نتائج مستنبط کرے۔ نوعِ انسان کے لئے علم حاصل کرنے کا یہ کلیہ ہے۔

لیکن اس کلیہ میں ایک استثنا (EXCEPTION) کی گئی تھی اور وہ تھی نبوت۔ نبی کو جو علم بذریعہ وحی حاصل ہوتا تھا وہ اس کے حواس کے ذریعے حاصل کردہ معلومات اور عقل و فکر کی رو سے مستنبط کردہ نتائج پر مبنی نہیں ہوتا تھا۔ اسے وہ علم، ایک خارجی حقیقت (OBJECTIVE REALITY) کے طور پر خدا کی طرف سے براہِ راست ملتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس علم کو خدا نے "تنزیل من رب العلمین" کہا ہے۔ یعنی خدا کی طرف سے نازل کردہ علم۔ عام علم، انسان کے سرچشمۂ فکر سے ابھر کر باہر آتا ہے لیکن وحی، قلبِ نبوی پر خارج سے نازل ہوتی تھی۔ اس میں اس کی اپنی فکر و جذبات کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا ــــــ

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۔ (۵۳/۳-۴) نبی اپنے فکر و جذبات کی رُو سے باتیں نہیں کرتا۔ اس کا علم وحی پر مبنی ہوتا ہے۔ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۔ (۵۳/۵) اسے وہ علم خدائے مقتدر کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔

یہ ذرائع علم (جو عام علمِ انسانی سے یکسر منفرد و مختص تھا) حضرات انبیاء کرامؑ کے لئے مخصوص تھا۔ اس کی کنہ و حقیقت کیا تھی؟ یہ نبی کو کس طرح ملتا تھا۔ اسے غیر از نبی (یعنی نبی کے علاوہ کوئی شخص) جان اور سمجھ نہیں سکتا۔ جو کچھ نبی کو وحی کے ذریعے ملتا تھا وہ اُسے انسانوں تک پہنچا دیتا تھا اور انسان اُسے غور و فکر سے سمجھ سکتے تھے لیکن وہ علم اُسے ملتا کس طرح تھا، اسے کوئی دوسرا شخص نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس لئے کہ انسانوں کے پاس سمجھنے کے ذرائع حواس اور قوتِ فکر ہے۔ اور وحی کا سرچشمہ ان سے ماورا تھا۔ اس لئے غیر از نبی اس حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا تھا، نہ پہنچ سکتا ہے کہ نبی کو یہ علم ملتا کس طرح تھا؟

ختمِ نبوت کے معنی یہ ہیں کہ (نبی اکرمؐ کے بعد) اس ذریعۂ علم کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا۔ جو علم خدا کی طرف سے براہِ راست دیا جانا مقصود تھا، وہ قرآن کریم کے اندر مکمل اور محفوظ کر دیا گیا اور اس کے بعد کہہ دیا کہ اب کسی انسان کو خدا کی طرف سے براہِ راست کوئی علم نہیں دیا جائے گا۔ اب انسانی علم کا وہی عام طریق ہے — یعنی حواس کے ذریعے حاصل کردہ معلومات اور غور و فکر کے ذریعے اخذ کردہ نتائج۔ خود قرآن کریم بھی غور و فکر کی رُو سے سمجھا جائے گا۔ ختمِ نبوت کا اعلان درحقیقت انسانی آزادی کا عظیم منشور تھا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ اب کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ کسی دوسرے انسان سے یہ کہہ کر اپنی بات منوائے کہ یہ میری بات نہیں، خدا کا حکم ہے جس کا علم اس نے مجھے براہِ راست دیا ہے۔ خدا نے جو احکام دینے تھے وہ قرآن کے اندر دے دیئے۔ قرآن کے علاوہ اب کسی کی کوئی بات سند و حجت نہیں سمجھی جائے گی۔

اب آپ دیکھئے کہ کشف و الہام یا خدا سے ہم کلامی سے مراد کیا ہے؟ اس سے مراد ہے خدا سے براہِ راست علم پانا۔ یعنی وہ علم جو انسانی حواس اور فکر و تدبر پر مبنی نہ ہو بلکہ ان ذرائع کے بغیر خدا سے براہِ راست حاصل ہو۔ آپ سوچئے کہ اس علم اور وحی کے ذریعہ حاصل کردہ علم میں (اصل و حقیقت کے اعتبار سے) فرق کیا ہے؟ فرق صرف الفاظ میں ہے۔ اصل و حقیقت دونوں کی ایک ہے۔ قرآن نے اس علم کے لئے وحی کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ یہ حضرات اسے الہام یا کشف کہہ کر پکارتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ الفاظ کے فرق سے اصل و حقیقت میں تو فرق نہیں آسکتا۔ اصل بات ذریعۂ علم کی ہے۔ اگر علم کا ذریعہ انسانی حواس اور فکر و تدبر ہے تو یہ علم نبوت سے الگ چیز ہے۔ اور اگر علم ان ذرائع کی رُو سے حاصل نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے متعلق دعوٰے یہ ہے کہ وہ براہِ راست خدا کی طرف سے ملتا ہے، تو یہ دعوٰے، صاحبِ وحی ہونے کا نہیں تو اور کیا ہے! اور اس طرح

خدا سے علم پانے کا دعوے کرنے والا، اپنا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لے، اس کے اس دعویٰ، اور دعوائے نبوت میں فرق کیا ہے۔ پھر سمجھ لیجئے کہ دعوائے نبوت سے مراد یہی تھی کہ ایسا دعویٰ کرنے والا کہتا یہ تھا کہ میرا علم، حواس و تفکر کا نتیجہ نہیں۔ یہ مجھے خدا کی طرف سے براہِ راست ملتا ہے۔ لہٰذا، جو شخص بھی اس قسم کا دعوے کرتا ہے، وہ درحقیقت نبوت کا دعوے کرتا ہے اور ختم نبوت کی مُہر کو توڑتا ہے۔ وہ جب کہتا ہے کہ مامور من اللہ ہوں تو وہ کہتا یہ ہے کہ یہ کچھ میں اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ مجھے خدا کی طرف سے حکم ملا ہے کہ میں ایسا کہوں؛ نبی بھی تو یہی کہتا تھا کہ میں جو کچھ کہتا ہوں، اپنی طرف سے نہیں کہتا، خدا نے مجھے ایسا کہنے کا حکم دیا ہے۔ جو شخص قرآن کا مبلّغ ہے، اس کا دعویٰ یہ نہیں ہوتا کہ میں خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل کر کے اسے دوسروں تک پہنچاتا ہوں۔ وہ کہتا یہ ہے کہ خدا نے جو علم اپنی کتاب میں محفوظ کر دیا ہے، میں اسے، اپنی فہم و بصیرت کے مطابق سمجھتا اور اس طرح اسے دوسروں تک پہنچاتا ہوں۔ لہٰذا، ختمِ نبوت کے بعد، قرآن کی تبلیغ و تعمیل باقی رہتی ہے، خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل کرنے کا امکان باقی نہیں رہتا۔ اس کا دعوے (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) نبوت کا دعویٰ ہے خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے۔ قرآنِ کریم میں (ختمِ نبوت کے بعد) نہ اس قسم کے علم کا تصور ملتا ہے، نہ کشف و الہام وغیرہ الفاظ۔ یہ تصور اور اس قسم کی اصطلاحات بعد کی وضع کردہ، یا دوسروں سے مستعار لی ہوئی ہیں۔ تصور اور اصطلاحات، تصوف کی رائج کردہ ہیں اور تصوف (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) "سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے"۔ نظامِ تصوف کے سرخیل، شیخ اکبر محی الدین ابن عربی سمجھے جاتے ہیں۔ آپ دیکھئے کہ وہ اپنے کشف و الہام کے متعلق جو کچھ کہتے ہیں، (لفظی فرق کو چھوڑ کر) اس میں اور وحیٔ نبوت میں فرق کیا رہ جاتا ہے۔ وہ اپنی کتاب فصوص الحکم میں لکھتے ہیں[1]:۔

> احادیث، روایت بالمعنیٰ اور ذاتی فہم کی غلطی سے معصوم نہیں۔ لہٰذا اولیاء ان کے متعلق رسولِ خدا سے براہِ راست دریافت کر لیتے ہیں اور جس مقام سے نبی لیتے تھے اسی مقام سے انسانِ کامل، صاحب الزمان، غوث، قطب لیتے ہیں۔ (اگرچہ) اولیاء انبیاء کے تابع ہوتے ہیں لیکن صاحبِ وحی دونوں ہوتے ہیں . . . . . اگرچہ رسول اللہؐ کے خلفاء دائرہ شرع سے باہر نہیں نکل سکتے مگر یہاں ایک دقیقہ ہے، نازک بات ہے۔ اس کو ہمارے ہی جیسے شخص جان سکتے ہیں۔ وہ دقیقہ یہ ہے کہ جب یہ شرعِ رسولؐ پر حکم کرتے ہیں تو ان کا ماخذ کیا ہوتا ہے۔ یہ کہاں سے حکم لیتے ہیں۔ (اربابِ شریعت) تو وہ ہیں جو

---

[1] فصوص الحکم کے متعلق علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ اس میں الحاد و زندقہ کے سوا کچھ نہیں!

قرآن و حدیث سے حکم لیتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں حکم نہیں ملتا تو قیاس کرتے ہیں اجتہاد کرتے ہیں۔ مگر اس اجتہاد کی اصل وہی منقول قرآن و حدیث ہیں۔ (ان کے برعکس) ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اس چیز کو اپنے کشف والہام کے ذریعے خود اللہ تعالےٰ سے لیتے ہیں۔ لہٰذا وہ خود اس حکم شرعی میں خلیفۃ اللہ ہیں پس ایک طور پر مادہ کشف والہام اور مادہ وحی رسول ایک ہے ۔ ۔ ۔ ۔ صاحب کشف اللہ تعالےٰ سے لینے کے طریقے سے واقف ہونے کی وجہ سے خاتم النبیین کے موافق ہے ۔ ۔ ۔ ۔ لہٰذا ان کا اللہ تعالےٰ سے لینا عین رسول اللہ کا لینا ہے۔

احادیث کے متعلق یہی مسلک مرزا غلام احمد صاحب (قادیانی) کا بھی تھا۔ وہ اس باب میں لکھتے ہیں :۔

اور جو شخص حکم ہو کر آیا ہو اس کو اختیار ہے کہ حدیثوں کے ذخیرہ میں سے جس انبار کو چاہے خدا سے علم پا کر قبول کرے اور جس ڈھیر کو چاہے خدا سے علم پا کر رد کر دے۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ)

دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

اور ہم اس کے جواب میں خدا تعالےٰ کی قسم کھا کر بیان کرتے ہیں کہ میرے اس دعویٰ کی بنیاد حدیث نہیں بلکہ قرآن اور وحی ہے جو میرے پر نازل ہوئی۔ ہاں تائیدی طور پر ہم وہ حدیثیں بھی پیش کرتے ہیں جو قرآن شریف کے مطابق ہیں اور میری وحی کے معارض نہیں اور دوسری حدیثوں کو ہم ردی کی طرح پھینک دیتے ہیں۔ (اعجاز احمدی صفحہ)[1]

احادیث کے رد و قبول کے معاملہ میں ہی نہیں بلکہ قرآن کے سلسلہ میں بھی ان کا یہی موقف تھا۔ لاہوری جماعت احمدیہ کے ترجمان "پیغام صلح" نے اپنی ۱۸ مارچ ۱۹۷۰ء کی اشاعت کے مقالہ افتتاحیہ میں "حدیث مجدد اور بعثت مجددین" کے سوال پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے۔

رہ گئی یہ بات کہ قرآن کریم کامل و مکمل ہے پھر اسے اپنی تعلیم کو پھیلانے کے لئے کسی مجدد کی ضرورت کس طرح ہو سکتی ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ اگر قرآن کریم کی تعلیم کو پھیلانے یا

---

[1] اس وقت اتفاق سے میرے پاس تحفہ گولڑویہ، اعجاز احمدی نہیں ہیں۔ میں نے مندرجہ بالا اقتباسات اور حوالے الیاس برنی مرحوم کی کتاب "قادیانی مذہب" سے نقل کئے ہیں۔ (اگرچہ مرزا صاحب کے لٹریچر کا مطالعہ کرتے وقت ان کی اس قسم کی متعدد تحریریں میری نظر سے گذر چکی ہیں۔ (پرویز)

اس کو تازہ کرنے کے لئے اس زمانہ میں پرویز صاحب اور ان جیسے دیگر علمائے قرآن کی ضرورت ہے تو کسی شخص کے خدا سے علم پاکر تجدید کے لئے کھڑا ہونے میں کونسی قباحت لازم آتی ہے۔ مجدد بھی تعلیم قرآن ہی کو تازہ کرتا ہے۔ وہ قرآن میں کمی بیشی تو نہیں کرتا۔ فرق صرف اتنا ہی ہے کہ وہ خدا سے حقائق و معرفت کا علم حاصل کرکے علومِ قرآن کی تجدید کرتا ہے اور مردہ دلوں میں زندگی کی روشنی پیدا کرتا ہے۔

اور یہی فرق ــــ جسے "اتنا ہی ہے" کہہ کر ایک معمولی سا فرق سمجھا گیا ہے، اصل دین اور دنیا کا فرق ہے۔ پرویز صاحب یا دیگر علمائے قرآن، قرآن کریم پر خود غور و فکر کرتے ہیں اور اس طرح قرآن کے جو حقائق ان کی سمجھ میں آتے ہیں انہیں یہ کہہ کر دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ یہ ہماری اپنی فہم کا نتیجہ ہے جس میں سہو و خطا کی گنجائش بھی ہے اور ان پر تنقید کا حق بھی ہر ایک کو حاصل ہے۔ لیکن جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ قرآن کے جو حقائق میں پیش کرتا ہوں وہ میری فکر و بصیرت کا نتیجہ نہیں بلکہ وہ خود خدا کے بتائے ہوئے حقائق ہیں، وہ انہیں سہو و خطا سے بھی منزہ قرار دیتا ہے اور ان پر تنقید کا حق بھی کسی کو نہیں دیتا۔ اس لئے کہ جو شخص اس کے پیش کردہ حقائق پر تنقید کرتا ہے وہ اس مدعی پر تنقید نہیں کرتا بلکہ (اس کے دعویٰ کے مطابق) خود خدا پر تنقید کرتا ہے ــــ اور یہ مقام نبی کے علاوہ اور کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا کہ اس کے پیش کردہ حقائق پر تنقید کو خود خدا پر تنقید قرار دیا جائے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن کریم میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ فَاِنَّهُمۡ لَا يُكَذِّبُوۡنَكَ وَلٰـكِنَّ الظّٰلِمِيۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجۡحَدُوۡنَ - (۶/۳۴)۔ "اے رسولؐ! یہ لوگ جو تیری پیش کردہ تعلیم کو سچا نہیں سمجھتے، یہ تجھے جھوٹا نہیں کہتے یہ خود خدا کی آیات کو جھٹلاتے ہیں۔"

ظاہر ہے کہ یہ فرق ایسا نہیں جسے "اتنا سا" کہہ کر انسان آگے بڑھ جائے۔ اگر آپ کسی کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ جن حقائق کو پیش کرتا ہے وہ خود خدا کے عطا فرمودہ ہیں تو آپ اُسے تنقید کی حد سے بالا تسلیم کرتے ہیں اور کسی کو تنقید کی حد سے بالا سمجھنا اس پر ایمان لانا کہلاتا ہے ــــ اور ختمِ نبوت کے بعد کوئی ایسی ہستی نہیں ہو سکتی جس پر ایمان لایا جائے۔ یعنی اس کی پیش کردہ تعلیم کو براہِ راست خدا کی طرف سے عطا کردہ سمجھ کر اسے تنقید کی حد سے بالا قرار دیا جائے۔ وذالک الدین القیم!

(۰)

وجدان

ایک صاحب نے اسی ضمن میں مجھ سے کہا ہے کہ جسے وجدان کہا جاتا ہے وہ بھی انسانی فکر کا نتیجہ نہیں ہوتا

اسے کس زمرہ میں شمار کیا جائے گا۔ مثلاً شاعر جسے "آمد" سے تعبیر کرتے ہیں اس میں اشعار بغیر فکری کاوش کے نوکِ قلم پر آتے چلے جاتے ہیں۔ اسی کو وہ وجدان کہتے ہیں۔

جواباً عرض ہے کہ یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ "وجدان" فوق الادراک ذریعۂ علم ہے۔ یہ فکری کاوش ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مثال سے یوں سمجھئے کہ انسان جب بات کرتا ہے تو اس میں اس کی کئی ایک صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں۔ وہ پہلے سوچتا ہے کہ مجھے کیا کہنا ہے۔ پھر اس کے لئے الفاظ کا انتخاب کرتا ہے۔ پھر ان الفاظ میں ایک ربط پیدا کر کے انہیں فقروں کی لڑی میں پروتا ہے۔ پھر ان فقروں کو زبان سے ادا کرتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ انسان کو ایک فقرہ بولنے کے لئے کس قدر فکری کاوش کرنی پڑتی ہے۔ جب بچہ پہلے پہل بولنا سیکھتا ہے تو اس کی یہ کاوش محسوس طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ لیکن آپ کسی شعلہ نوا مقرر کو دیکھئے۔ وہ دو سو لفظ فی منٹ کی رفتار سے بولتا ہے، گھنٹوں مسلسل بولتا چلا جاتا ہے۔ وہ برق رفتاری میں اپنے موضوع کے متعلق سوچتا بھی ہے، اس کے اظہار کے لئے الفاظ کا انتخاب بھی کرتا ہے۔ ان الفاظ کو فقروں میں مربوط بھی کرتا ہے۔ پھر ان فقروں کو اس طرح زبان سے ادا کرتا ہے کہ نہ صرف الفاظ کا تلفظ نہ بگڑنے پائے بلکہ ان الفاظ کی ادائیگی سے جذبات کی بھی صحیح صحیح نمود ہو جائے وہ یہ سب کچھ برق کی سی تیز رفتاری کے ساتھ کئے چلا جاتا ہے اور سامعین تو ایک طرف خود اُسے بھی اس کا علم و احساس نہیں ہوتا کہ وہ کب سوچتا ہے، کس طرح الفاظ کا انتخاب کرتا ہے، کب ان لفظوں کو فقروں کے قالب میں ڈھالتا ہے اور پھر کس طرح دریا کی سی روانی کے ساتھ انہیں ادا کئے چلا جاتا ہے۔ اس کے اس عمل میں ہمیں کہیں فکری کاوش نظر نہیں آتی۔ لیکن اس حقیقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ یہ ہوتا فکری کاوش ہی کا نتیجہ ہے۔ فکری کاوش میں ممارست سے انسان میں اس قسم کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ جب اپنی توجہ کو کسی خاص نقطہ یا موضوع پر مرکوز کرتا ہے تو اس کے ذہن کی مشینری کے مختلف پُرزے بیک وقت حرکت میں آجاتے ہیں اور اس تیزی سے حرکت کرتے ہیں کہ فکر کی عام سست خرامی اس حرکت کا احساس نہیں کر سکتی، بعینہٖ جس طرح پانچ ہزار فی سیکنڈ کی رفتار سے گردش کرنے والے پہیے کی حرکت کی تیزی سے تیز نگاہ بھی محسوس نہیں کر سکتی۔ وہ ساکن نظر آتا ہے۔ عصرِ حاضر کے علم النفس کی تحقیق یہ ہے کہ ہماری معلومات، نفس غیر شعوری کے ریکارڈ روم میں جمع رہتی ہے اور جب شعور کی مشینری حرکت میں آتی ہے تو وہ ذخیرہ ریکارڈ روم سے ابھر کر شعوری سطح پر آنا شروع ہو جاتا ہے۔ شعور کی مشینری کی رفتار جس قدر تیز ہوگی اسی قدر سرعت کے ساتھ یہ ذخیرہ شعور کی سطح پر آتا جائے گا۔ (جیسا کہ ابھی ابھی کہا جا چکا ہے) اگر اس مشینری کی حرکت کی رفتار برق پا ہے تو شعور کو اس کا احساس بھی نہیں ہونے پائے گا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو رہا ہے۔ اور سننے والا ہی نہیں خود کہنے والا بھی فرطِ حیرت سے پکار اُٹھے گا کہ ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے[1]

حالانکہ اس میں نہ غیب کا کوئی دخل ہوتا ہے اور نہ ہی صریرِ خامہ کسی سروش کی نوا ہوتی ہے۔ چنانچہ اس قسم کے "وجدانی" اشعار کو خود غالبؔ بھی گفتۂ غالبؔ ہی کہتا ہے اور وہ ہوتے بھی گفتۂ غالبؔ ہی ہیں۔ یہ ہے وجدان کی حقیقت۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے دور کا وجدان (INTUITION) کا سب سے بڑا مؤید 'برگسان' اسے (A HIGHER KIND OF INTELLECT) "ایک بلند نوعِ فکر" ہی قرار دیتا ہے۔ لہٰذا وجدان بھی کوئی فوق الفکر ذریعۂ علم نہیں[2] فوق الفکر ذریعۂ علم صرف ایک ہی تھا — یعنی وحی — جو بابِ نبوت کے بند ہو جانے کے بعد ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ (پرویز)

---

[1] تصوف میں قوتِ خیال کے ارتکاز سے اس قسم کی وجدانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جسے غلطی سے فوق الفکر ذریعۂ علم سمجھ لیا جاتا ہے۔ نبی کو اپنے ذریعۂ علم (وحی) کے متعلق کوئی غلط نہیں ہوتی۔ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَ مَا غَوٰى۔ (۵۳/۲)

[2] میں نے اپنی کتاب "ابلیس و آدم" میں وحی کے عنوان کے تابع 'وجدان' کے متعلق جو کچھ لکھا تھا، نظرِ ثانی کے وقت محسوس ہوا کہ اس میں بعض مقامات وضاحت طلب ہیں۔ اس کتاب کے آئندہ ایڈیشن میں ان مقامات کی وضاحت کر دی جائے گی۔

اسے نوٹ فرمالیں

پرچہ نہ ملنے کی اطلاع ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک بھیج دیجئے۔ آپ کو دوبارہ پرچہ بھیج دیا جائیگا۔ اسکے بعد اطلاع دینے والے احباب کو پرچہ اسی صورت میں بھیجا جائے گا کہ وہ سٹاک میں موجود ہو اور وہ بھی تھوڑا بھیجا جائے گا۔

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

ضروری نوٹ ماہنامہ طلوعِ اسلام اور ادارہ طلوعِ اسلام کا لٹریچر میسرز پنجاب نیوز فوارہ چوک راجہ لاہور سے حاصل کریں۔

حقائق وعبر

۱- "مہدی آخر الزمان"

پچھلے دنوں انڈونیشیا کی ایک خاتون اور ان کے شوہر ایک ہونے والے بچے کے سلسلہ میں جو کچھ کرتے پھر رہے تھے وہ تماشہ چند دنوں کے بعد ختم ہو گیا اور تحقیق نے ثابت کر دیا کہ وہ سب فریب تھا لیکن اس سلسلہ میں ایک بات ایسی سامنے آئی جس سے یونہی آگے نہیں بڑھا جا سکتا۔ ۱۶ مارچ ۱۹۷۰ء کے مشرق (لاہور) میں اس سلسلہ میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ

> مولوی محمد شفیع اوکاڑوی نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہ بچہ مہدی آخر الزمان ہو سکتا ہے کیونکہ انبیاء اور اولیاء کرام کے شکم مادر میں رہتے ہوئے اپنی ماں سے ہمکلام ہونے کی مثالیں موجود ہیں۔ اور اسرائیل میں ایک چشم موشے دایان کی موجودگی اور مکہ معظمہ میں بچے کی پیدائش کی پیش گوئی سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ بچہ مہدی آخر الزمان ہو سکتا ہے۔

یعنی وہ بچہ جو رحم مادر میں موجود ہی نہیں تھا اور جس کی ماں معدے کے ریاح کو بچہ بنائے پھر رہی تھی، "پادر ہوا" ہی کو کہا جاتا ہے۔

—— (۱) ——

۲- فتوے کا اصل مقصد

۱۱۳ "حضرات علمائے کرام" نے مزعومہ سوشلسٹوں کے خلاف جو کفر کا فتوے صادر فرمایا ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے احتشام الحق صاحب نے کہا ہے کہ

> فتویٰ منشائے الٰہی کا اظہار اور قرآن و سنت کی ترجمانی کا نام ہے۔
>
> (روزنامہ امروز۔ لاہور۔ ۱۶ مارچ ۱۹۷۰ء)

احتشام الحق صاحب کا تعلق دیوبند سے ہے اور دیوبندی حضرات کے خلاف اس سے پہلے کفر کے کئی ایک فتوے لگ چکے ہیں۔ مثلاً "تین صد علماء کا متفقہ فتوے" میں جسے محمد ابراہیم بھاگلپوری نے شائع کیا تھا لکھا تھا۔

> وہابیہ دیوبندیہ اپنی تمام عبارتوں میں تمام اولیاء، انبیاء، حتےٰ کہ حضرت سید الاولین والآخرین (صلے اللہ علیہ وسلم) اور خاص ذات باری تعالےٰ کی اہانت اور ہتک کرنے کی وجہ سے قطعاً مرتد اور کافر ہیں اور ان کا ارتداد اور کفر سخت سے سخت درجہ تک پہنچ چکا ہے ایسا کہ جو ان مرتدوں اور کافروں کے ارتداد اور کفر میں ذرا سا بھی شک کرے وہ مرتد اور کافر ہے۔

مارچ ۱۹۵۳ء میں کراچی کے در و دیوار پر ایک اشتہار چسپاں کیا گیا تھا جس پر (۲۸) علماء حضرات کے دستخط تھے۔ اور انہوں نے علماء دیوبند کے متعلق مطالبہ کیا تھا کہ انہیں علیحدہ اقلیت قرار دیا جائے۔ ان میں مفتی محمد شفیع اور احتشام الحق صاحب کے نام خاص طور پر درج تھے۔

یہاں پہلا سوال یہ ابھرتا ہے کہ اگر فتوے منشائے خداوندی کا اظہار ہوتا ہے تو ان علماء کی طرف سے جو فتوے علمائے دیوبند (بالخصوص خود احتشام الحق صاحب) کے خلاف شائع ہوا تھا وہ بھی منشائے خداوندی کا اظہار تھا یا نہیں۔ اگر وہ بھی منشائے خداوندی ہی کا اظہار تھا تو اس کی رو سے منشائے خداوندی میں خود احتشام الحق صاحب کافر قرار پاتے ہیں۔ اور اگر وہ منشائے خداوندی کا اظہار نہیں تھا، تو موجودہ فتویٰ کس طرح منشائے خداوندی کا اظہار قرار پاتا ہے؟

دوسرا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ اگر علماء کے فتویٰ سے لوگ فی الواقعہ کافر ہو جاتے ہیں تو احتشام الحق صاحب (اور انہی کے زمرہ کے دیگر حضرات) خود کافر قرار پا چکے ہیں۔ اس لئے جو خود کافر ہوں انہیں اس کا کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ دوسروں کے کفر و ایمان کے فیصلے کریں۔ اور اگر اُن علماء کے فتووں سے احتشام الحق صاحب وغیرہ کافر نہیں ہوتے مسلمان کے مسلمان رہے ہیں، تو جن لوگوں کے خلاف انہوں نے اب فتویٰ صادر فرمایا ہے وہ کس طرح کافر ہو جائیں گے؟

——— (۰) ———

۳۔ اسلام کی یہ تعلیم نہیں

روزنامہ مشرق (لاہور) کے سنڈے ایڈیشن میں (جو غالباً ۱۲ اپریل کا ایڈیشن تھا) مولانا عبدالمجید بھاشانی صاحب کا ایک طویل انٹرویو شائع ہوا ہے جس میں حسب ذیل سوال اور جواب غور طلب ہیں۔

سوال:- آپ نے ٹوبہ ٹیک سنگھ کی کسان ریلی میں گوریلا جنگ کی دھمکی دی ہے۔ آپ یہ جنگ عوام

اور حکومت دونوں میں سے کس کیخلاف لڑینگے؟

جواب :- آپ اسے دھمکی کہتا ہے، ہم گوریلا جنگ ضرور لڑے گا۔ یہ جنگ جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور بھارتی اور امریکی ایجنٹوں کے خلاف لڑی جائے گی۔ یہ لوگ جہاں بھی موجود ہوگا ہم وہیں اسے مارے گا۔

سوال :- کیا تشدد اور گھیراؤ کی تحریک اسلامی تعلیمات کے منافی نہیں ہے؟

جواب :- میں جس اسلام کا پیرو ہوں اس میں چوروں اور ڈاکوؤں کو مارنا جائز ہے۔ جہاں تک اسلام کی تعلیمات کو میں سمجھتا ہوں ان میں تو یہی ہے کہ اگر کوئی شخص مسلمانوں پر ظلم ڈھائے، ان کے حقوق کو پامال کرے اور ان کی عزت اور آبرو سے کھیلے تو مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ظالم کے خلاف ہتھیار اٹھالے اور ظالم کو اس کے کئے کی سزا دے۔ تاریخ اسلام شاہد ہے کہ جنگِ بدر، جنگِ احد اور جنگِ حنین، ظلم اور جبر کا سر کچلنے کے لڑی گئی تھیں اور رسول اللہ نے ظالموں کے خلاف جہاد کیا تھا۔

طلوعِ اسلام :- یہ ٹھیک ہے کہ ظالموں اور غاصبوں کا سر کچلنا ضروری ہے اور ان کے خلاف جنگ کرنا دین کے فرائض میں سے ہے۔ لیکن اسلام ہر فرد کو اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ جس شخص کو ظالم اور غاصب سمجھے اس کا سر کچل دے یا ایک پارٹی بنا کر ان کے خلاف جنگ شروع کر دے۔ اسلام ظالموں اور غاصبوں کے سر کچلنے اور عند الضرورت ان کے خلاف جنگ کرنے کی اجازت حکومت کو دیتا ہے افراد کو نہیں۔ اگر افراد کو اس قسم کا لائسنس دے دیا جائے تو معاشرہ میں ایسی انارکی پھیل جائے جس میں کسی کا کچھ بھی محفوظ نہ رہے۔

انارکی کی یہ آواز ایک طرف سے اٹھی۔ اس کے مقابلہ میں جماعتِ اسلامی کی مجلس عاملہ نے اس سلسلہ میں یہ تجویز پاس کی ہے کہ

> ملک میں ہر جگہ ایسی تنظیمیں قائم ہونی چاہئیں جو اس غرض کے لئے پوری طرح مستعد ہوں کہ جہاں بھی گوریلا جنگ سر اٹھائے، وہیں اس کا سر کچل دیں اور جس جگہ بھی سوشلسٹ اپنی مار دھاڑ، جلاؤ اور گھیراؤ کی مہم شروع کریں اسی جگہ ان کو ناکام بنا دیں۔ یہ تیاری اس غنڈہ گردی کے شروع ہونے سے پہلے ہو جانی چاہیئے۔ ورنہ اگر اچانک لوگوں کی بے خبری کی حالت میں وہ شروع ہو گئی تو نتائج اس سے زیادہ ہولناک ہونگے جو دسمبر ۱۹۶۸ء سے مارچ ۱۹۶۹ء تک کے زمانے میں رونما ہوئے تھے۔
>
> (ایشیا - ۱۲ اپریل ۱۹۷۰ء)

اگر بھاشانی صاحب کی ظالموں اور غاصبوں کو کچلنے کی تدبیر اسلامی تعلیم کے خلاف ہے، تو اس کے مداوا کے لئے جو کچھ جماعتِ اسلامی تجویز کر رہی ہے وہ اس سے بھی زیادہ خلافِ اسلام ہے۔ اسلام اس کی اجازت بھی کسی

(باقی صفحہ ۸۰ پر)

زینہ بہ زینہ
منافع ہی منافع

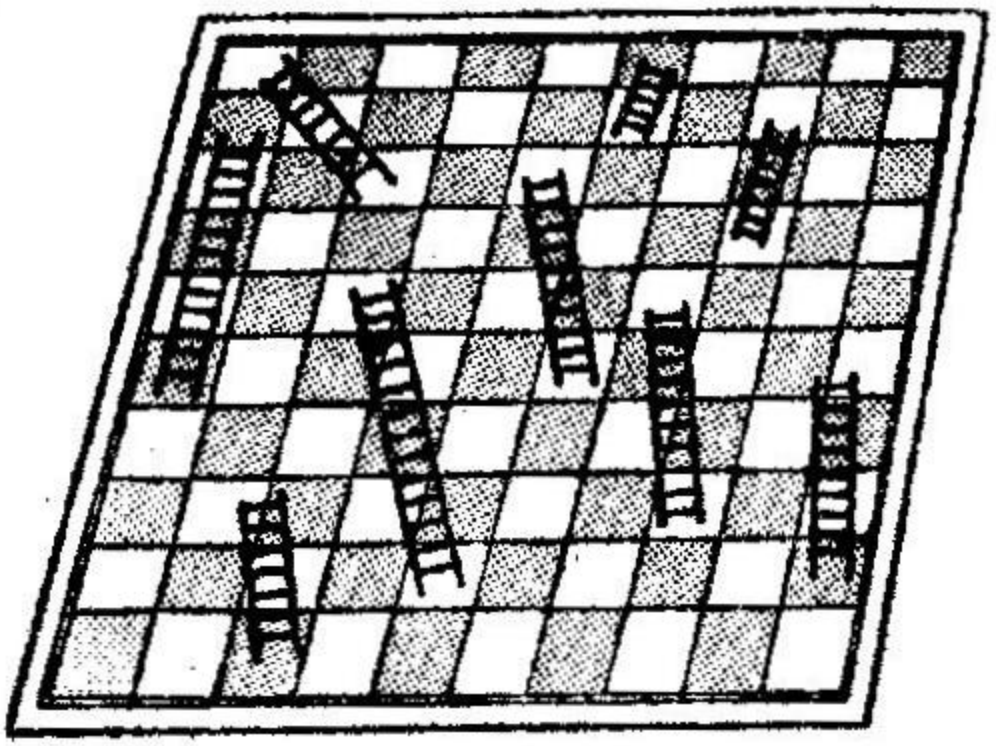

ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ خرید کر رکھنے میں سراسر فائدہ ہے ایک تو آپ اپنی قوم کی حفاظت میں شریک کار ہوں گے، اس کے علاوہ حکومت آپ کی رقم اور ۱۰ فیصدی سالانہ منافع کی ادائیگی کی ضمانت دیتی ہے۔ منافع پر ٹیکس معاف۔ سرمایہ کاری کے لئے ٹیکس میں رعایت

آپ کا سرمایہ دس سال میں دگنا ہو جائے گا

بچت کیجئے

ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ

5 ـ 10 ـ 50 ـ 100 ـ 500 ـ 1000 اور 5,000 روپے کی قیمت کے سرٹیفکیٹ

ADGROUP - CDNS

نقد و نظر

قصص الانبیاء کے رموز اور ان کی حکمتیں

ہمارے ہاں کے متاخرین میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا مقام منفرد ہے۔ انہوں نے صدیوں سے جمی ہوئی تقلید کی سلوں کو توڑنے کی کوشش کی اور دینی مسائل میں فکر کی طرح ڈالی۔ اس کے نتائج اکثر و بیشتر خوشگوار مرتب ہوئے لیکن شاید ماحول کی مجبوری تھی یا افتادِ طبیعت کا اثر کہ شاہ صاحبؒ تقلید کے بندھنوں سے کماحقہٗ رستگاری حاصل نہ کر سکے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی فکر عجیب قسم کا ملغوبہ بن کر رہ گئی اور جہاں جہاں انہوں نے مفاہمت (COMPROMISE) کی کوشش کی غلط اور صحیح میں التباس ہو گیا۔ آپ ان کی فکر کی ندی کے ساتھ ساتھ چلئے۔ آپ دیکھیں گے کہ ایک مقام پر اس میں نہایت صاف اور شفاف آب رواں ہے۔ لیکن ذرا آگے بڑھیئے تو وہ پانی گدلا ہونا شروع ہو جاتا ہے اور جب اس میں تصوف کا دھارا آکر ملتا ہے تو اس کا رنگ، بُو اور مزہ سب بدل جاتے ہیں۔ کرنے کا کام یہ تھا کہ ان کی تصانیف میں سے ان حصوں کو الگ کر لیا جاتا جن میں انہوں نے قرآنی حقائق کو فکرو بصیرت کی روشنی میں پیش کیا ہے اور انہی مقامات کی عام اشاعت کی جاتی۔ اس سے قوم کو بھی صحیح راہ نمائی ملتی اور خود شاہ صاحبؒ کی عظمت بھی اجاگر ہوتی۔ لیکن جس قوم کے اعصاب پر شخصیت پرستی سوار ہو، اس کے ہاں اسلاف کے کارناموں کی اس انداز سے تحقیق کو کفر و الحاد سے کم نہیں سمجھا جاتا۔ نتیجہ یہ کہ جو کچھ کسی کی زبان اور قلم سے نکل گیا وہ مرورِ زمانہ سے نہ صرف عینِ حق بن گیا بلکہ حق و باطل کا معیار قرار پا گیا۔ یہی کچھ بدقسمتی سے شاہ صاحبؒ کے ساتھ ہو رہا ہے۔ شاہ ولی اللہ اکادمی (حیدرآباد) شاہ صاحبؒ کی تصانیف کی اشاعت کا اہتمام کر رہی ہے اور اس سلسلہ میں وہ اسی روشِ کہن پر کاربند ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب جو شاہ صاحبؒ کی کتاب "تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء" کا اردو ترجمہ ہے، انہی کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اپنی اس کتاب میں شاہ صاحبؒ نے بتایا ہے کہ انبیاءِ کرام کے جو قصے قرآن میں مذکور ہیں وہ محض داستانیں نہیں، ان میں دین کے اہم رموز و غوامض پوشیدہ ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے اس باب میں کس قسم کے رموز و اسرار کا انکشاف فرمایا ہے، ان میں سے ہم چند ایک کو مثال کے طور پر بیان کرتے ہیں۔

(۱) حضرت ایوبؑ کے قصہ میں لکھتے ہیں :-

ایک روز حضرت ایوبؑ غسل کر رہے تھے کہ اللہ کی رحمت سے ٹڈیاں آئیں اور جب ان کے گھر میں پڑیں تو سب سونے کی ہو گئیں۔ اور ان میں سے ایک گھر کے باہر گری تو اس کو بھی اٹھا لائے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جب کسی کی طرف سے رحمت متوجہ ہوتی ہے تو حتی الامکان اس کو چھوڑنا نہیں چاہیئے۔ (ص۹۲)

قرآن کریم میں ان ٹڈیوں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

آگے چل کر لکھتے ہیں :-

حضرت ایوبؑ نے یہ منت مانی تھی کہ اپنی بیوی کو سو درے ماریں گے اور اللہ تعالےٰ کی ان پر رحمت اور آسانی کی نظر تھی۔ تو نذر کی ایفا میں حقیقی صورت کو چھوڑ کر اس کی ظاہر صورت پر اکتفا کی ..... کیونکہ اللہ تعالےٰ کا اپنے پیارے بندوں کے ساتھ برتاؤ ایسا ہی ہوتا ہے کہ ان سے حدود شرعیہ کی ظاہری صورت پر اکتفا کی جاتی ہے۔ اصل حقیقت کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ (ص۹۲)

اس قسم کا اختصاص قرآنی تعلیم میں تو کہیں نہیں ملتا۔

(۲) ساحرین دربار فرعون کے ساتھ حضرت موسےٰؑ کے مقابلہ کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

اُس دور میں جادو انسانی حواس میں تصرف کرنے کا نام تھا۔ یہاں تک کہ لوگ اجسام طبعی میں وہ اوصاف اور عوارض خیال کرتے تھے جو درحقیقت ان میں نہیں پائے جاتے تھے۔ پھر ظاہر ہوا حق اس جیسی صورت میں اور جادو باطل تھا کیونکہ وہ ایک تخیل ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں۔ اور (یہ عالم مثال سے آنا) حق ہے کیونکہ اس کی اصل ہے۔ (ص۱۰۲)

اگر حق باطل کی شکل میں لوگوں کے سامنے آئے تو لوگ حق اور باطل میں تمیز کس طرح کر سکیں گے؟

(۳) قصہ سامری کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں کہ :-

حضرت موسےٰؑ کے کوہ طور پر جانے کے بعد سامری نے لوگوں کو اس طرح گمراہ کیا کہ روح (جبریل) کے قدم سے مٹھی بھر مٹی لے کر بچھڑے کے قالب میں ڈال دی۔ اس کی خاصیت یہ تھی کہ جس شے پر گذرتی تھی اس میں اس کی مناسب زندگی لوٹ آتی تھی۔ (ص۱۰۶)

قرآن نے تو ایسا کہیں نہیں کہا۔ اور اگر بچھڑے میں یہ خاصیت پیدا ہو گئی تھی کہ اس سے مردہ اشیاء میں زندگی پیدا ہو جاتی تھی تو اس کے معبود تسلیم کر لینے میں کسر کیا رہ گئی تھی؟

(۴) حضرت سلیمانؑ کے تذکرہ کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

پانچواں واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بلقیس کے تخت کو احکام ناسوتیہ (اس دنیا کے اثرات سے) خالی کر کے انہیں عالمِ مثال[1] کی شے بنا دیا۔ پھر حضرت سلیمانؑ کے اصحاب میں سے ایک نیک بندے کی دعا کی برکت سے اس جگہ اسے ناسوت (اس دنیا کی چیز) لباس پہنایا۔ حضرت سلیمانؑ اس عورت سے نکاح کا ارادہ رکھتے تھے۔ انہوں نے بلقیس کے عقل و جمال کو پرکھنے کے لئے ایک حیلہ سے کام لیا کہ اس کے تخت کو بدل دیا۔ بلقیس نے اُسے پہچان لیا۔ حضرت سلیمانؑ نے اس کی (خوبصورت) پنڈلی کو دیکھ لیا۔ اور آپ نے یہ دیکھ لیا کہ وہ بڑی خوبصورت عورت ہے۔ (ص ۱۳۱)

یہ خدا کے ایک اولوالعزم پیغمبر کے متعلق کہا جا رہا ہے!

(۵) حضرت مریمؑ کے قصہ کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں (اور ہم اسے قارئین سے بصد معذرت نقل کرتے ہیں)

پھر حضرت مریمؑ کو اس جگہ روحانی قوتوں کے ساری و جاری ہونے کے زمانے میں ماہواری کے دن آئے۔ جب ان سے پاک ہوئیں تو لوگوں سے دور ایک الگ مکان میں غسل کرنے کے لئے گئیں اور پردہ ڈال کر کپڑے اتارے۔ اللہ تعالیٰ نے انکی طرف ایک کامل خلقت جوان کی صورت میں جبرئیل کو بھیجا جو جوانی اور خوبصورتی سے بھرا ہوا تھا۔ حضرت مریمؑ نے ان کو دیکھا۔ وہ خود بھی جوان اور قوی مزاج والی تھیں۔ ان کو اپنے نفس پر فساد کا ڈر لاحق ہوا۔ اور دل سے اللہ کے حضور میں دعا کی کہ ان کی عصمت پر کوئی حرف نہ آئے۔ پھر ان کو ایک عجیب حالت پیش آئی۔ طبیعت میں قوائے نسلیہ کا ہیجان ہوا اور اس سے وہ (لذت کی) کیفیت پیدا ہوئی جو جماع کے وقت ہوتی ہے جیسے کبھی کسی کو دیکھنے سے انزال ہو جاتا ہے۔ ... جب حضرت جبرئیل نے ان سے کہا کہ میں تو بڑے رب کا بھیجا ہوا ہوں کہ تمہیں ایک ستھرا لڑکا دوں تو حضرت مریم خوش اور مانوس ہو گئیں۔ حضرت جبرئیل نے جب ان کو اس حال میں

---

[1] "عالمِ مثال" کا تصور سب سے پہلے افلاطون نے پیش کیا تھا جو بعد میں ہمارے تصوف کی بنیاد بن گیا۔

دیکھا تو ان کے ستر میں پھونک ماری۔ اس پھونک سے ان میں تاثر پیدا ہوا اور ان کو انزال ہو گیا۔ حضرت مریمؑ کے نطفے میں مرد کے نطفے جیسی قوت تھی اس لئے وہ حاملہ ہو گئیں۔

(صفحات ۱۱۱-۱۱۲)

ہم شاہ ولی اللہ اکادمی کے ارباب بست و کشاد سے اتنا دریافت کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کے اردو ترجمہ کی اشاعت سے (دین کی تو چھوڑیئے) خود شاہ صاحبؒ کی کونسی خدمت سرانجام دی ہے؟ یہ کتاب عربی میں تھی (اور شاید ایک عرصہ سے کم یاب تھی) عام لوگوں کو معلوم نہیں تھا کہ شاہ صاحبؒ کس قسم کے "رموز" بیان فرماتے تھے۔ اب اس کے ترجمہ کی عام اشاعت سے یہ تمام راز طشت از بام ہو گئے۔ یہ شاہ صاحبؒ سے "نادان دوستی" ہے۔

کتاب ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ طباعت، کتابت، کاغذ عمدہ ہے۔ اور تین روپے میں شاہ ولی اللہ اکادمی حیدرآباد (سندھ) سے مل سکتی ہے!

(باقی)

بقیہ "حقائق و عبر"
(مسلسل از صفحہ ۵)

کو نہیں دیتا کہ وہ ایسی تنظیمیں (یعنی اپنی فوج) تیار کر لیں اور پھر جنہیں مفسد سمجھیں ان کے خلاف تلواریں اٹھا کر میدان میں نکل آئیں۔ اسلام، مفسدوں کی سرکوبی کی ذمہ داری بھی حکومت پر عاید کرتا ہے۔ افراد کو اس کا لائسنس نہیں دیتا۔

ہم حیران ہیں کہ ملک میں ایک باقاعدہ حکومت کی موجودگی میں "مجاشانی صاحب کی جنگ" اور جماعت اسلامی کی اس طرح مدافعت کو کیا کہہ کر پکارا جائے اور تماشا یہ کہ یہ دونوں جماعتیں، اپنی اپنی تجاویز کو اسلام کی تعلیم کہہ کر پیش کر رہی ہیں۔

باقی رہا یہ کہ ۱۹۵۳ء میں یہاں کیا ہوا تھا تو وہ کچھ اس لئے ہوا تھا کہ خود آپ حضرات نے ہنگامہ آرائیوں اور شورش انگیزیوں سے نظام حکومت معطل کر دیا تھا جس کی وجہ سے فساد برپا کرنے والوں کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔

جس ملک کے راہنماؤں کی یہ حالت ہو، اس ملک کا مستقبل کیا ہوگا اور اس میں بسنے والے بدنصیبوں کا حشر کیا، اس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے — خدا عدو کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلائے!

(باقی)